اجراء حسبِ ارشاد: شیخ الحدیث حضرت مولانا مشرف علی تھانوی قدس سرہ

مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر: ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۳ | ذو الحجة ۱۴۴۳ھ | جولائی ۲۰۲۲ء | شمارہ ۷

المورد الفرسخی فی المولد البرزخی

برزخ (قبر) کی زندگی (قسط دوم)

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ = /۴۰ روپے　　زر سالانہ = /۴۰۰ روپے

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

ماہنامہ الامداد لاہور

35422213
35433049

پتہ دفتر

جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

وعظ

المورد الفرسخی فی المولد البرزخی

(برزخ (قبر) کی زندگی) قسط دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے

ولادت ناسوتیہ وملکوتیہ کے متعلق یہ وعظ ۷ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ بروز شنبہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا حاضرین کی تعداد پچاس کے قریب تھی قریباً ۴ گھنٹہ میں ختم ہوا مولانا ظفر احمد صاحب نے قلمبند کیا۔

خلیل احمد تھانوی

۱۹/۱۲/۲۰۲۱

وعظ

الموردالفرسخی فی المولدالبرزخی

(برزخ (قبر) کی زندگی) قسط دوم

موازنہ موت وحیات.....	۷	اہل کشف کی غلطی کا ازالہ.....	۲۳
حیات ناسوتی.....	۸	مفارقت دائمہ.....	۲۵
پیدائش اور موت کی حقیقت...	۹	واقعہ معراج پر اشکال کا رد.....	۲۶
وطن اصلی.....	۱۰	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حال...	۲۷
عالم ارواح میں رہنے کی تمنا..	۱۲	اشکال کا جواب.....	۲۷
درجات قرب.....	۱۳	صدیق اکبرؓ کا تحمل وثابت قدمی...	۲۸
عالم دنیا میں بھیجنے کی وجہ.....	۱۴	سرکار دوجہاں کی پسند.....	۳۰
حصول قرب الٰہی کا طریقہ.....	۱۵	طبعی تقاضا.....	۳۳
اعمال صالحہ کی اقسام.....	۱۵	عارف کی شان.....	۳۳
فضیلت فقہاء.....	۱۷	موت پر رنج طبعی کی وجہ.....	۳۴
مزاج شناسی.....	۱۸	حضرت فاطمہؓ کی معرفت.....	۳۵
اشاراتی گفتگو.....	۱۹	عارفین کی حالت.....	۳۶
مسخرہ پن.....	۲۰	کاملین کی پہچان.....	۳۷
فقہاء کا تفقہ.....	۲۰	سوال کا جواب.....	۳۷
اللہ کی عنایت.....	۲۲	رحمۃ للعالمین.....	۳۹
آخرت میں قرب تام کا حصول....	۲۳	اشکال کا جواب.....	۳۹

رحمۃ للعالمین ہونے کا مطلب	۴۱	برکات سفر آخرت	۵۳
فتح مکہ کے فوائد	۴۲	جان گدازی ودلنوازی	۵۶
ترجمہ وتفسیر سورۃ	۴۲	فکر وفات	۵۷
عقلاء صحابہ کا ایمان لانا	۴۳	رفع اشکالات	۵۸
بشارت تکمیل دین	۴۵	اشکال دوم کا رفع	۵۹
ارتفاع حجاب	۴۷	حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے میں حکمت	۶۰
توجہ الی اللہ	۴۹	آدمؑ کا دنیا میں نزول، باعثِ ترقی تھا	۶۲
دیدار بلاواسطہ اور بواسطہ کا فرق ...	۵۰	نعمت موت	۶۲
آغاز اجتہاد	۵۲	اخبار الجامعہ	۶۶
کفارہ مجلس			

❁❁❁

❁

نوٹ: گزشتہ وعظ کا آخری عنوان (وجود باری کی دلیل) تھا

موازنہ موت وحیات

اسی طرح اس ولادت ناسوتیہ(۱) کے وقت اور کوئی کمال بھی نہیں ہوتا تو یہ ولادت ایسی ناقص ہوئی کہ اس کے ساتھ متصلاً کمالات حاصل نہیں ہوتے اور ولادت ملکوتیہ کے متصل ہی آدمی جامع کمالات ہوتا ہے غرض حیات ملکوتیہ حیات ناسوتیہ سے ادوم بھی ہے اور اتم بھی اور اقوم بھی اور افضل بھی اور اکمل بھی اور اجل بھی اور ابقیٰ بھی ہے اور اقویٰ بھی اور اعلیٰ بھی اور اصفی بھی ہے اور ازکیٰ بھی اور استی بھی، انفع بھی ہے اور ارفع بھی اور اوقع بھی، احلی بھی ہے اور اشہی بھی اور اخطٰی بھی۔ جی چاہتا ہے کہ اور بیس تیس قافئے کہہ ڈالوں جو شاید سوچنے سے نکل بھی آئیں مگر اس وقت مجھے مولانا کا قول یاد آ گیا۔

قافیہ اندیشم و دلدار من گویدم مندیش جز دیدار من (۲)

مولانا بعض مقامات پر ترک قافیہ کی وجہ بتلاتے ہیں کہ بعض جگہ مثنوی میں قافیہ کی رعایت اس لیے نہیں ہے کہ جب میں قافیہ سوچنے کا قصد کرتا ہوں تو محبوب فرماتے ہیں کہ ہمارے سوا کسی کو نہ سوچو۔ پس بے تکلف قافیہ آجاتا ہے تو کہہ دیتا ہوں ورنہ سوچتا نہیں ہوں۔ اس لیے میں بھی اس وقت قافیہ کو چھوڑتا ہوں اور ان کے ذکر میں لگتا ہوں کیونکہ ان کے حبیب کا ذکر انہی کا ذکر ہے جب حیات ملکوتیہ حیات ناسوتیہ سے اعظم ہے(۳) تو ولادت ملکوتیہ یعنی حیات ملکوتیہ کی ابتداء، کہ سفر آخرت یا وفات ہے ولادت ناسوتیہ یعنی حیات ناسوتیہ کی ابتداء سے کہ ولادت متعارفہ ہے، نیز اہم واعظم ہوگی اور اس سے زیادہ قابل ذکر ہوگی۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ناسوتیہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آپ کی ولادت ملکوتیہ کا (گو اس کا نام لغوی وفات ہی ہو) کیوں نہ ذکر کیا جاوے۔ بہرحال میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفر آخرت کا ذکر اس حیثیت سے اختیار نہیں کیا کہ وہ سفر آخرت ہے بلکہ اس حیثیت سے اختیار کیا ہے کہ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حیات

---

(۱) دنیوی پیدائش (۲) ’’میں شعر کا قافیہ سوچتا ہوں اور میرا محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ میرے دیدار کے سوا کچھ نہیں سوچ (۳) برزخی زندگی دنیوی زندگی سے بڑھ کر ہے۔

کی ابتداء کا ذکر ہے۔ پس جیسا ولادت ناسوتیہ کا ذکر مولد ہے اسی طرح ولادت ملکوتیہ کا ذکر بھی مولد ہی ہے بلکہ اس ولادت ملکوتیہ کے اقویٰ وافضل ہونے کے سبب یہ مولد کی اعلیٰ قسم ہے۔

اور دونوں حیات کے تفاوت کے مضمون پر مجھ کو ایک مستقل مسئلہ یاد آ گیا۔ اس مسئلہ پر بھی متنبہ کرتا ہوں کہ علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ موت وحیات میں افضل کون ہے۔ حیات افضل ہے یا موت۔ اس میں دو قول ہیں۔ بعض نے حیات کو ترجیح دی ہے اور بعض نے مت کو۔ دلائل فضیلت حیات میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ طول حیات میں تکثیر اعمال ہے جس سے ثواب بڑھتا ہے اور موت سے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے حیات من حیث ھی حیات کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی بلکہ ایک عارض کی وجہ سے فضیلت ثابت ہوئی اور وہ عارض بھی عندالتامل راجع ہے(۱) فضیلت موت ہی کی طرف۔ کیونکہ اعمال کا ثمرہ موت ہی کے بعد ملے گا۔ تو اس میں خود اقرار ہے فضیلت موت کا اور موت کی فضیلت ذاتی ہے جس کی صریح دلیل نص ہے کہ حدیث میں آیا ہے۔ تحفۃ المؤمن الموت(۲) کہ موت مومن کے لیے تحفہ ہے۔ پس مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے جو چیز بطور تحفہ کے ملتی ہے وہ موت ہی ہے۔ حیات کو کہیں تحفہ نہیں کہا گیا اور ذاتی فضیلت کے علاوہ موت کے لیے عارضی ترجیح بھی ثابت ہے۔ چنانچہ میں نے ثابت کر دیا ہے کہ موت کے بعد جو حیات حاصل ہوتی ہے وہ اس حیات سے افضل واکمل واقویٰ وادوم ہے جب ہر طرح حیات ملکوتیہ کا حیات ناسوتیہ سے اکمل ہونا ثابت ہوگیا تو میرا دعویٰ اس سے لزوما ثابت ہوگیا کہ ولادت ملکوتیہ ولادت ناسوتیہ سے اہم واعظم ہے اور اس اہمیت کی نسبت میں نے کہا تھا کہ یہ اہمیت باعتبار حقیقت کے بھی ہے اور باعتبار آثار کے بھی۔ یہاں تک تو حقیقت کی حیثیت کا بیان مقصود تھا۔

حیات ناسوتی

باقی آثار کی حیثیت سے اہمیت اس لیے ہے کہ ولادت ناسوتیہ جن منافع کا

(۱) غور کرنے پر موت ہی کی طرف لوٹتا ہے (۲) اخرجہ ابن المبارک وابن ابی الدرداء والطبرانی والحاکم۔

مقدمہ ہے حیات ملکوتیہ ان منافع سے افضل واکمل منافع کا مقدمہ ہے۔ عام مومنین کی موت بھی جس کا بیان بضمن اہمیت باعتبار حقیقت کے استطراداً آ بھی چکا ہے حضور ﷺ کی وفات بھی پھر وہ بھی دو اعتبار سے عام مؤمنین کے منافع کے اعتبار سے بھی اور خود حضور ﷺ کے منافع کے اعتبار سے بھی۔ اس کا بیان عنقریب ہوگا۔ اہمیت من حیث الآثار کی شق کا انتظار رفع کرنے کے لیے اتنی تنبیہ کردی گئی بیان کا منتظر رہنا چاہئے۔

پیدائش اور موت کی حقیقت

اب میں مضمون متصل کی طرف رجوع کرتا ہوں اور حیات وموت کے متعلق ایک لطیف نکتہ عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ اب تک تو میں نے موت کا حیات ہونا ثابت کیا تھا۔ اب حیات کو موت بتاتا ہوں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ موت کی حقیقت معنویہ انتقال من عالم الی عالم آخر ہے(۱)۔ یعنی ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے کو موت کہتے ہیں تو جس طرح حیات ناسوتی کا(۲) انقطاع یعنی ولادت ملکوتیہ موت اس لیے ہے کہ اس سے عالم ملکوت کی طرف انتقال ہوتا ہے اسی طرح ولادت ناسوتیہ(۳) بھی اس لیے ایک قسم کی موت ہے کہ اُس وقت اس شخص کا عالم ارواح سے عالم اجسام کی طرف انتقال ہوا ہے بلکہ اس کو موت کہنا زیادہ زیبا ہے کیونکہ موت صوری(۴) سے تو وطن اصلی کی طرف انتقال ہوتا ہے اور ولادت ناسوتیہ(۵) کے وقت وطن اصلی سے وطن عارضی کی طرف انتقال ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ وطن اصلی کی طرف جانا تو مطلوب ہوتا ہے اس کو موت کہنا محض عرف کی بناء پر ہے اصل موت تو یہی ہے کہ وطن اصلی کو چھوڑ کر وطن عارضی میں آجائے۔ مگر چونکہ عام طور پر لوگ وطن اصلی سے غافل ہیں اور اسی عالم ناسوت(۶) کو وطن اصلی سمجھے ہوئے

(۱) ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونا (۲) جسمانی حیات کا ختم ہونا جو کہ روحانی ولادت ہے کو موت کہتے ہیں کیونکہ عالم روحانی کی طرف آدمی منتقل ہوتا ہے۔ (۳) اسی طرح جسمانی ولادت بھی ایک قسم کی موت ہے کیونکہ عالم ارواح سے عالم اجسام کی طرف منتقل ہوا (۴) صورۃ جو دنیا میں ہوتی ہے مرکز اپنے اصلی وطن یعنی جنت میں جاتا ہے (۵) دنیا میں جب آدمی پیدا ہوتا ہے تو در اصل اپنے وطن اصلی عالم ارواح سے وطن عارضی عالم اجار کی طرف منتقل ہوتا ہے اس لیے پیدائش بھی ایک قسم کی موت ہے کیونکہ اس میں بھی انتقال ہو رہا ہے (۶) لوگ دنیا کو وطن اصلی سمجھتے ہیں۔

ہیں اس لیے وہ حیات ناسوتیہ ہی کے انقطاع(۱) کو موت کہتے ہیں اور ولادت ناسوتیہ(۲) کو موت نہیں کہتے اور جس کی نظر وطن اصلی پر ہے وہ اس کا عکس سمجھتا ہے(۳)۔

جیسے آج کل ہم لوگ تھانہ بھون میں رہتے ہیں اور اسی کو اپنا وطن سمجھتے ہیں لیکن جو تاریخ کا محقق ہے وہ جانتا ہے کہ یہ ہمارا وطن اصلی نہیں ہے بلکہ ہم تو اصل میں عرب کے رہنے والے ہیں۔ وہاں سے آکر یہاں بس گئے۔ یہ شخص یہاں رہ کر بھی عرب کو یاد کرے گا۔ اسی طرح محققین دنیا میں آکر اپنے وطن اصلی کو یاد کرتے ہیں اور وہاں سے جدا ہونے پر تاسف کرتے ہیں(۴)۔

وطن اصلی

چنانچہ مولانا جامی اسی وطن اصلی کا پتہ دیتے ہیں اور وہاں سے مفارقت پر رنج ظاہر کرتے ہیں۔

دلا تا کی دریں کاخ مجازی کنی مانند طفلاں خاکبازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخ کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرازاں آشیاں بیگانہ گشتی چودوناں چغد ایں ویرانہ کشتی

بھلا فانی جہاں میں کب تک اے دل۔ رہے گا کھیل تیرا آب اور گل، تو ہی ہے لاڈ کا پالفا وہ طائر قفس سے آشیاں تیرا ہے ظاہر، ہوا اس آشیاں سے کیوں تو محروم، بنا ہے اس بیاباں کا کیوں تو۔

صاحبو! وہ تھا ہمارا وطن اصلی یعنی عالم ارواح جس کے سامنے یہ عالم ناسوت(۵) ویرانہ ہے اس کی جدائی پر حزن(۶) ہونا چاہئے نہ کہ یہاں سے جدا ہونے پر چنانچہ مولانا اسی کو یاد کرکے فرماتے ہیں۔

بشنو از نے چون حکایت میکند وزجدائیہا شکایت میکند

''نے'' سے مراد روح ہے

کہ نیستاں تامرا ببریدہ اند از نیفرم مردوزن نالیدہ اند

(۱) اس لیے وہ دنیوی زندگی کے منقطع ہونے کو موت کہتے ہیں (۲) دنیاوی پیدائش کو موت نہیں کہتے (۳) جس کی نظر وطن اصلی یعنی جنت پر ہے وہ پیدائش کو موت اور موت کو حیات سمجھتا ہے (۴) افسوس کرتے ہیں (۵) عالم دنیاوی (۶) غم۔

''نیستان'' سے مراد عالم ارواح ہے جس سے جدا ہو کہ روح نالہ وفریاد کر رہی ہے

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق　　تا بگوید شرح دارد اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　باز جوید روزگار وصل خویش
من بہر جمعیتے نالاں شدم　　جفت خوش حالاں وبدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یارمن　　وز درون من نجست اسرار من
سر من از نالۂ من دستور نیست　　لیک چشم وگوش را آں نور نیست
تن زجان وجاں زتن مستور نیست　　لیک کس را دید جاں دستور نیست(۱)

اخیر میں فرماتے ہیں۔

آتش است ایں بانگ نامی ونیست باد　　ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد(۲)

یعنی روح کا عالم ارواح کی طرف اشتیاق واقعی ہے بناوٹی بات نہیں جس میں یہ اشتیاق نہ ہو وہ نیست ہوجائے۔ پس وہ ہے حقیقت میں وطن جس کے فراق میں روح آہ ونالہ کر رہی ہے جس کو معاد (۳) وعالم ارواح کہتے ہیں جب اس وطن سے دوسرے عالم میں آئے تو بتلایئے یہ حقیقی موت ہے یا نہیں۔ یقیناً ہے تو اگر غیر محقق عاشق کو ہمارے ذکر وفات شریف پر وحشت ہے تو اس کو اپنے ذکر ولادت شریف پر بھی وحشت ہونا چاہئے۔ کہ وہ بھی ایک قسم کی وفات ہے بلکہ صوری وفات سے بڑھ کر ہے جیسا بیان ہوا(۴)

(۱) ''میں فراق محبوب سے چاک چاک ہوجانے کا خواہش مند ہوں تا کہ درد اشتیاق کی کیفیت کو وہ اچھی طرح بیان کر سکے جو شخص اپنی اصل سے دور رہ کر اپنے اصل سے ملنے کے ذرائع تلاش کرے۔ میں ہر جماعت سے نالاں رہا خوش حال و بدحال لوگوں کے ساتھ رہا۔ ہر شخص اپنے گمان سے میرا ساتھی بنا اور اندر سے میرے باطنی اسرار کا طلبگار نہ ہوا۔ میرے باطنی کمالات میرے نالہ سے دور نہیں لیکن ہر شخص کے پاس اسرار باطن دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان نہیں۔ روح سے بدن اور بدن سے روح چھپی ہوئی نہیں لیکن کسی کو روح دیکھنے کا ملکہ نہیں'' (۲) ''روح کا نالہ وفریاد ایک آگ ہے جس کو یہ آگ حاصل نہ ہو وہ فنا ہوجائے (۳) لوٹ کر جانے کی جگہ یعنی آخرت (۴) جب عالم ارواح وطن اصلی ہو اور روح اس وطن اصلی میں رہنے کی مشتاق بھی ہے وہاں سے جب اس کو دنیا میں منتقل کیا گیا تو یہ منتقل اس کے لیے موت ہے جس پر وہ فریاد کر رہی ہے پس اگر عاشق کو ذکر وفات سے وحشت وگھبراہٹ ہے تو اس کو ذکر ولادت سے بھی وحشت وگھبراہٹ ہونی چاہیے کہ وہ بھی تو موت ہی ہے۔

عالم ارواح میں رہنے کی تمنا

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب یہ حیات بھی موت ہی ہے اور ہم اصل میں عالم ارواح میں تھے تو پھر وہاں سے نکال کر ہم کو یہاں کیوں بھیجا گیا۔ اگر وہیں رکھا جاتا تو اچھا تھا کیونکہ وہ اصلی وطن بھی تھا اور وہاں کی حیات یہاں سے افضل بھی تھی اور وہاں یہاں سے زیادہ قرب بھی تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اعمال کے لیے بھیجا گیا ہے اور اسی عارض اعمال کی وجہ سے اس حیات موجودہ[۱] کو اس حیات ماضیہ[۲] پر ترجیح ہے جو کہ یہاں آنے سے پہلے ہم کو حاصل تھی۔ اس کو محققین نے سمجھا ہے ورنہ مغلوب الحال تو یہی چاہتے ہیں کہ عالم ارواح ہی میں رہتے تو اچھا تھا کیونکہ بظاہر وہاں آرام تھا اور قرب بھی تھا۔ چنانچہ اسی کو ایک عاشق کہتے ہیں۔

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

وجہ یہ کہ خیال عادۃً فراق[۳] میں ہوتا ہے نہ کہ وصال وقرب[۴] میں اور حضرت عارف جامی نے بھی مثنوی کے ابتدائی اشعار کی شرح میں اس مضمون کو ایک خاص عنوان سے ادا کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

حبذا روزیکہ پیش از روز وشب　　فارغ از اندوہ وآزاد از طلب
متحد بودیم بادشاہ وجود　　حکم غیریت بکلی محو بود
نے بلوح علم شان نقش ثبوت　　نی رفیض خوان ہستی خوردہ قوت
نے زحق ممتاز ونے از یک دگر　　غرق در دریائے وحدت سربسر[۵]

---

(۱) موجودہ زندگی (۲) گزشتہ زندگی پر (۳) جدائی (۴) نہ کہ ملاقات اور قرب کے وقتخواہش سے آزاد تھا (۵) ’’اس دن رات سے پہلے دن بھی کیا ہی اچھا تھا کہ جب غم فراق اور وصال کی ہم بادشاہ وجود (خالق) کے ساتھ متحد تھے جہاں غیریت کا بالکل نام نہ تھا۔ نہ تو ان کی لوح علمی پر ہمارے ثبوت (وجود) کا کوئی نقش تھا اور نہ خوان ہستی کے فیض سے کوئی غذا حاصل تھی۔ نہ ہم حق سے جدا کوئی شئے تھے نہ باہم ایک دوسرے سے ممتاز دریائے وحدت میں پوری طرح غرق تھے‘‘۔

امتیاز علمی آمد دربیاں بے نشانے را نشاں باشد عیاں
واجب و ممکن زہم ممتاز شد رسم وآئین دوئی آغاز شد(۱)

ان کا وہی حاصل ہے جو مثنوی کے اشعار ابتدائیہ کا حاصل ہے کہ اس عالم کی تمنا کی ہے اور یہاں آنے پر تاسف ہے(۲) مگر یہ غلبہ حال ہے تحقیق نہیں ہے کیونکہ سمجھنے کی بات ہے کہ اس عالم کی تمنا کیوں ہے۔

درجات قرب

اسی لیے تو، کہ وہاں تو قرب تھا اور قرب کی حالت یہ ہے کہ اس کی کچھ حد نہیں۔ غیر متناہی ہے چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو باوجود غایت قرب کے امر ہے۔ وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا (۳)۔ معلوم ہوا کہ قرب کی انتہا کسی درجہ پر نہیں۔ ہر درجہ سے آگے بھی درجات ہیں اور ظاہر ہے کہ قرب طبعاً محبوب ہے تو اس کا ہر درجہ محبوب ہے۔ خصوصاً عشاق کو کہ وہ تو اگر یہ جان لیں کہ قرب کے اور بھی درجات ہیں تو ان کو حالت موجودہ پر کبھی صبر نہیں ہوسکتا۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

دلا رام در بر دلارام جو لب از تشنگی خشک و برطرف جو
نگویم کہ برآب قادر نیند کہ بر ساحل نیل مستسقی اند(۴)

اور کہتے ہیں۔

دامان نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار گلچین بہار تو زداماں گلہ دارد(۵)

غرض زیادت قرب سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا۔

---

(۱) ''علمی امتیاز بھی درجہ بیان وتفصیل میں پیدا ہوا بے نشانی کا نشان ظاہر ہوا۔ واجب اور ممکن ایک دوسرے سے ممتاز ہوئے اس کے بعد کوئی اور یگانگت کا رسم ورواج ہوا'' (۲) افسوس ہے (۳) آپ ﷺ فرماتے کہ اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما (۴) محبوب سے ہمکنار اور محبوب کی تلاش پیاس سے ہونٹ خشک اور لب دریا سیرابی کے طلب گار میں یہ نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں لب دریا ہوتے ہوئے جلندھر (پیاس کی بیماری) کے بیمار کی طرح ہیں (۵) ''نگاہ کا دامن تنگ ہے اور تیرے حسن کے پھول کثرت سے ہیں (اس لیے) تیری بہار حسن اک گلچین (اپنے) دامن کی تنگی کا گلہ رکھتا ہے کہ اس کو دامن اتنا تنگ کیوں ملا''۔

عالم دنیا میں بھیجنے کی وجہ

تو اب سمجھئے کہ اس عالم میں قرب تو تھا مگر وہ حد خاص پر متوقف تھا بڑھتا نہیں تھا کیونکہ عادت یہ ہے کہ قرب بڑھتا ہے جانبین کے تعلق سے(۱) سے اور حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ اس کو بندہ کے ساتھ تعلق اس وقت بڑھتا ہے جب ادھر سے طلب ہو۔ گو طلب کی توفیق بھی اول ادھر ہی سے ہوتی ہے مگر ترقی بعد طلب ہی کے عطا ہوتی ہے۔ ان کی عادت یہی ہے کہ اول طلب پیدا کرتے ہیں پھر قرب کو بڑھاتے ہیں اور طلب کی حقیقت ہے عمل اور وہاں عمل تھا نہیں۔ اس لیے قرب نہ بڑھتا تھا(۲)۔ اس لیے عالم ارواح سے عالم اجسام میں بھیجا تا کہ طلب سے عمل ہو اور اس سے ترقی کا باب مفتوح ہو(۳)۔ چنانچہ حدیث قدسی میں خود فرماتے ہیں: من تقرب الی شبرا تقربت الیه ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیه باعا ومن اتانی یمشی اتیته هرولة او کماقال(۴) کہ جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں ایک باع یعنی دو پھیلے ہوئے کھلے ہوئے ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

سبحان اللہ! کس قدر عنایت ہے کہ وہ بندہ کی ذرا سی طلب پر کس قدر توجہ فرماتے ہیں اور واقعی یہ راستہ بندہ کے چلنے سے تھوڑا ہی طے ہوسکتا تھا وہ اس قدر غیر محدود مسافت ہے جو کہیں ختم ہی نہیں ہوتی اس کی تو حالت یہ ہے۔

نہ گردد قطع ہرگز جادہ عشق از دوید نہا
کہ میں بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا(۵)

---

(۱) دونوں طرف سے تعلق ہونے پر (۲) عالم ارواح میں عمل تھا نہیں اور قرب الٰہی عمل سے بڑھتا ہے تو دنیا میں عمل کرنے کے لیے بھیجا تا کہ قرب بڑھے ((۳) ترقی کا دروازہ کھل جائے (۴) ''کنز العمال: ۱۷۹، مسند الامام أحمد: ۲/ ۴۱۳، ۳/ ۴۰، الترغیب والترہیب: ۴/ ۱۰۴، مجمع الزوائد: ۱۰/ ۹۶ (۵) ''راہ عشق دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا بلکہ تاک کی طرح قطع کرنے سے اور زیادہ بڑھتا ہے''۔

یہ تو ان ہی کے قطع کرنے سے طے ہوسکتی ہے جس کی صورت یہ ہے کہ اول بندہ کچھ چلنا شروع کرتا ہے پھر وہ دوڑ کر اس کے پاس خود چلے آتے ہیں۔

حصول قرب الٰہی کا طریقہ

غرض مزید قرب کے لیے طلب اور طلب کے بعد سعی (۱) کی ضرورت ہے کیونکہ حق تعالیٰ جسم تو ہیں نہیں جو نعوذ باللہ کسی مکان میں ہوں یا کسی چیز میں حلول کئے ہوں کہ انتقال مکانی سے دوڑ کر مسافت کو طے کرلیا جائے اور اللہ میاں کی گود میں جا بیٹھیں۔ خدا تعالیٰ اس سے منزہ ہیں۔ ان کے ساتھ قرب حاصل کرنا یہی ہے کہ ان کی رضا حاصل کی جائے ان کو اپنے سے خوش کیا جائے اور ان کی عنایات وتوجہ کو اپنی طرف مائل کیا جائے۔ بس یہ ہے قرب حق کا حاصل اور حق تعالیٰ کی رضا وتوجہ صرف ایک چیز پر منحصر ہے، وہ کیا ہے اعمال صالحہ۔ جب بندہ اعمال صالحہ اختیار کرتا ہے اس وقت حق تعالیٰ کی توجہ اس پر منعطف ہوتی ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ أُوْلَٰٓئِكَ هُمۡ خَيۡرُ ٱلۡبَرِيَّةِ جَزَآؤُهُمۡ عِندَ رَبِّهِمۡ جَنَّٰتُ عَدۡنٖ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدٗاۖ رَّضِيَ ٱللَّهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُواْ عَنۡهُۚ ذَٰلِكَ لِمَنۡ خَشِيَ رَبَّهُۥ (۲) اس میں رضا وقرب کو ایمان واعمال صالحہ پر مرتب فرمایا ہے۔

اعمال صالحہ کی اقسام

جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا کہ قرب کے معنی رضا ہیں اور رضا اعمال صالحہ پر موقوف ہے تو اب سمجھئے کہ اعمال صالحہ کی دو قسمیں ہیں ایک اعمال قلبیہ (۳) دوسرے اعمال قالبیہ (۴) جو کہ جوارح سے متعلق ہیں۔ پھر اعمال قلبیہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک مکسوبہ ایک موہوبہ (۵)۔ مثلاً اصل محبت، اصل خشیت، اصل شوق وغیرہ۔ یہ اعمال

(۱) کوشش (۲) ”بے شک جو لوگ ایمان لائے انہوں نے اچھے کام کئے وہ لوگ بہترین خلائق ہیں ان کا صلہ ان کے پروردگار کے یہاں ہمیشہ رہنے کی بہشتیں ہیں اللہ تعالیٰ ان سے خوش رہے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے، یہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے“ سورۃ البینہ: ۷۔۸ (۳) دل کے اعمال (۴) جوارح کے اعمال (۵) ایک وہ اعمال جو کسب سے حاصل ہوں دوسرے جو اللہ کی عطا ہوں۔

قلبیہ موہوبہ (۱) ہیں اور ان چیزوں کو بڑھانا ذکر اور مراقبات وریاضات وغیرہ سے یہ اعمال قلبیہ مکسوبہ (۲) ہیں اور ظاہر ہے کہ اصل اعمال قلبیہ وہی ہیں جن میں اکتساب (۳) واختیار کو دخل ہے۔ موہوبہ کو اعمال کہنا مجاز ہے اور قرب بھی جس کی تحصیل قصد سے ہوسکتی ہے انہیں اعمال سے ہوتا ہے جو اختیاری ہیں۔ پس عالم ارواح میں اعمال قالبیہ سے تو مطلقاً حرمان تھا اور اعمال قلبیہ میں سے جو مکسوب (۴) ہیں ان سے بھی حرمان (۵) تھا کیونکہ وہاں آلات اکتساب (۶) ہی موجود نہ تھے۔ اس لیے قرب تو وہاں بے شک تھا مگر ایک حد پر تھا کہ اس سے آگے ترقی نہ ہوسکتی تھی کیونکہ وہاں اعمال پر قدرت ہی نہ تھی۔ سو محقق کو تو عالم ارواح کے تصور سے بھی بے چینی ہوتی ہے کہ وہاں کیا خاک چین تھا۔ آرام وراحت تو یہاں ہے کہ رات دن جتنی ترقی چاہو اعمال کے ذریعہ سے کرسکتے ہو کوئی اس کے لیے حد ہی نہیں۔ کسی درجہ بھی پہنچ کر ترقی بند نہیں ہوتی عاشق کو بھلا اس پر کہاں چین آسکتا ہے کہ محبوب سامنے ہو اور وہ یہ کہہ دے کہ خبردار آگے نہ بڑھنا مجھ سے دوگز دور رہو۔ عاشق کو محبوب کے سامنے اس بعد پر کیونکر صبر آسکتا ہے وہ تو یہ چاہتا ہے کہ محبوب سے لپٹ جاؤں بلکہ اس سے زیادہ وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ مجھے لپٹ جائے عشاق اس کو جانتے ہیں مگر عشاق میں جو فساق ہیں ان کے معاملات کا تصور مت کرنا بلکہ اس کو اپنی بیویوں ہی میں سوچ لینا کہ تم بیوی کو لپٹو اس میں زیادہ لطف ہے۔ یا بیوی تم کو لپٹے اس میں زیادہ لطف ہے ظاہر ہے کہ بیوی کے لپٹنے میں اور زیادہ لطف ہے۔ لیجئے میں نے فساق کی مثال چھوڑ کر اتقیاء کی مثال اختیار کرلی۔ اس کے تصور میں تو کوئی مانع نہیں، غرض عاشق کو محبوب کے سامنے فصل پر (۷) چین نہیں آسکتا۔ اگر اس کا مکلّف بھی کیا جاوے تو اس کی تو وہی حالت ہوجاوے گی۔

(۱) اللہ کی عطاء ہیں (۲) ذکر وغیرہ سے ان کو بڑھانا یہ بندے کا فعل ہے (۳) انسان کے فعل واختیار کو دخل ہو (۴) دل کے وہ اعمال جس میں انسان کے کسب کو دخل ہے (۵) محرومی (۶) کسب کے آلات یعنی ہاتھ پیر آنکھ کان وغیرہ (۷) جدائی پر۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ　　باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش(۱)

تو صاحب! عالم ارواح میں تو ایسا ہی قرب تھا کہ بس دور سے جھڑمٹی دیکھتے رہو۔ پاس آنے کی اجازت نہیں۔

فضیلت فقہاء

تو حضور وہاں کہاں چین تھا۔ بس وہ حالت تھی جیسے ایک صاحب کا سوال آج کل آیا ہے۔ ہمارے یہاں عجیب عجیب سوالات آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص کسی عورت پر عاشق تھا۔ عورت شریف خاندان کی تھی اور یہ عاشق صاحب گھٹیا خاندان کے تھے۔ اس کے کفو نہ تھے جب آپ نے نکاح کا پیغام دیا تو اس نے عدم کفائت کا عذر کیا کہ تیرے نکاح سے میری نسل بگڑے گی۔ عاشق صاحب نے کہا کہ میں تو نکاح کر کے صرف دیدار چاہتا ہوں اور کچھ نہ کروں گا۔ چنانچہ وہ اس شرط پر نکاح کرنے کو آمادہ ہوگئی کہ مجھ سے مقاربت نہ کرنا۔ عورت بھی بڑی ہمت کی تھی اور اسی شرط پر نکاح ہوگیا کچھ دنوں تو عاشق نے صبر کیا مگر پاس لیٹ کر پھر صبر کس سے ہو۔ اب میاں کی جان پر بنی تو استفتاء کیا ہے کہ اگر میں صحبت کرلوں تو خلاف شرط ہونے کے سبب نکاح میں تو خلل نہ آئے گا اور یہ بھی لکھا کہ وہ راضی نہیں ہے۔ میں نے لکھا پاگل ہے جو اس شرط کی رعایت کرتا ہے۔ یہ شرط فاسد ہے اور نکاح صحیح ہوگیا اور عورت کی ناراضی کی کچھ پرواہ نہیں تم کو پورے اختیارات ہیں۔ کیا تم عورت ہو جو ایک عورت پر قابو یافتہ نہ ہوسکو۔ اگر فقہاء نہ ہوتے اور آج کل کے محدث ہوتے جن کو محدث (بے وضو) کہنا چاہئے۔ تو وہ کہتے کہ نکاح ہی صحیح نہیں ہوا کیونکہ حدیث میں ہے نھی عن بیع و شرط۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے۔ اسی لیے بیع میں شرط کرنے سے بیع بھی فاسد ہوجاتی ہے اور شرط بھی اور نکاح بھی مثل بیع کے ایک معاملہ ہے کیونکہ اس میں منافع عورت کو مہر کے معاوضہ میں لیا جاتا ہے۔ اس لیے یہاں بھی نکاح اور شرط دونوں فاسد ہونے چاہئیں۔

حضرت اگر فقہاء کا وجود نہ ہوتا تو یہ لوگ بیع مشروط بشرط فاسد کی طرح

(۱) ''درمیان دریا میں تختہ ڈال کر باندھ دیا پھر کہتے ہو کہ خبردار دامن تر نہ ہو''۔

تمام عقود کو فاسد کہتے۔ مگر خدا جزائے خیر دے حضرات فقہاء کو کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزاج شناس ہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لب ولہجہ کو پہچانتے ہیں۔

مزاج شناسی

مزاج شناسی پر مجھے علی حزیں شاعر کا قصہ یاد آ گیا۔ یہ ایران کے شہزادوں سے ہے بڑا نازک مزاج تھا۔ اس لیے کوئی شخص اس کی خدمت گاری نہ کرسکتا تھا۔ صرف ایک خادم رمضانی اس کا مزاج شناس تھا وہی اس کی خدمت کرتا تھا۔ اور وہ رمضانی ایسا نوکر تھا کہ علی حزیں کے ساتھ اشعار میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ علی حزیں کھانا کھا رہا تھا مکھیوں نے پریشان کیا تو کہنے لگا۔

رمضانی مگساں می آیند(۱)

رمضانی مکھیاں کہاں سے آتی ہیں۔

اس نے فوراً جواب دیا

نا کساں پیش کساں می آیند

اسی طرح ایک دفعہ رات کو آنکھ کھل گئی تو رمضانی سے پوچھا

از شب چہ قدر رسیدہ باشد

رات کس قدر باقی ہے۔

اس نے آسمان کو دیکھ کر فوراً جواب دیا۔

زلفش بہ کمر رسیدہ باشد

یعنی آدھی رات ہوگئی ہے۔ ایسے ہی بہت سے لطیفے رمضانی کے منقول ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض نوکر نہ تھا بلکہ یار آشنا اور ہم مذاق دوست تھا۔ جو محض محبت کی وجہ سے شاہزادہ کی خدمت کرتا تھا بلاتکلم خطابات کا علم دونوں کو سینہ بسینہ تھا(۲)۔ درسفینہ نہ تھا۔ اشاروں میں باتیں ہوتی تھیں اور رمضانی ہی کا دماغ تھا جو ان اشاروں کو سمجھتا تھا۔

(۱) حضور نالائق لائق کے پاس آ ہی ہیں (۲) بغیر کلام کئے دونوں ایک دوسرے کے اشارات کو سمجھتے تھے۔ ایک کے دل سے بات دوسرے کے دل میں پہنچ جاتی۔

اشاراتی گفتگو

چنانچہ علی حزیں جب ہندوستان آیا تو اس نے شاہ دہلی سے درخواست کی کہ میرے پاس صرف ایک خادم رمضانی ہے اور کام زیادہ ہے غریب کو راحت کا وقت نہیں ملتا۔ اس لیے ایک اور خادم تجویز کیا جائے تا کہ رمضانی کو کچھ راحت مل جائے۔ اس کی نزاکت تو مشہور تھی ہی۔ شاہ دہلی نے اپنا خادم خاص جو نہایت تعلیم یافتہ ہوشیار و عقلمند تھا بھیج دیا۔ دو تین ہی دن گزرے تھے کہ علی حزیں شطرنج کھیلنے بیٹھا اور نئے خادم کو حکم دیا کہ باغ کے دروازے پر جس میں سکونت (۱) تھی بیٹھ کر دربانی کی خدمت انجام دے اور جو کوئی آوے اس کو اطلاع کرے وہ دروازے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک شخص کسی کا رقعہ لے کر آیا اور دربان سے کہا شاہزادے کو یہ رقعہ پہنچا دو اور جواب لے آؤ۔ یہ رقعہ لے کر پہنچا۔ علی حزیں نے اس کو دیکھا اور دیکھ کر ناک بھوں چڑھا کر رقعہ واپس کر دیا۔ اب یہ خادم بڑا حیران کہ میں کیا کروں۔ رقعہ لے کر واپس کروں یا رکھ لوں اور واپس کروں تو قاصد کو کیا جواب دوں۔ اتنی ہمت کہاں تھی کہ علی حزیں سے پوچھتا کہ حضور اس کا کیا جواب دیا جائے۔ ہیبت کے مارے کچھ نہ پوچھ سکا کیونکہ نزاکت مزاج تو مشہور تھے آخر کار دوڑا ہوا رمضانی کے پاس آیا اور کہا، بھائی! میں تو مصیبت میں پھنس گیا ذرا بتلاؤ تو میں کیا کروں۔ شہزادہ نے تو ناک بھوں چڑھا کر رقعہ پھینک دیا اور زبان سے کچھ بھی نہیں کہا رمضانی نے رقعہ کا مضمون دیکھا تو کسی دوست نے لیمون ترش کی فرمائش لکھی تھی کہ اپنے باغ سے دے دیئے جائیں۔ رمضانی نے کہا کہ شہزادہ نے ترشرو ہو کر اس رقعہ کا جواب دیا ہے جس میں لیموں ترش دینے کی اجازت ہے۔

شاہ دہلی کے خادم نے جو یہ مطلب سنا تو سناٹے میں آ گیا اور اپنا بوریہ بستر باندھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا اور رمضانی سے کہا بھائی! علی حزیں کے پاس رہنے کی ہمت تجھی کو ہے دوسرے کا یہاں کام نہیں۔ پھر یہ شاہ دہلی کے پاس پہنچا اور بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور چاہے مجھے پھانسی دے دیں یہ منظور ہے مگر علی حزیں کے پاس رہنا

(۱) جس میں رہائش پذیر تھا۔

منظور نہیں۔ اس کے یہاں آدمیوں کا کام نہیں وہاں تو فرشتوں کا کام ہے جن کو ہر وقت الہام ہوتا رہے وہ تو ایسے اشاروں میں باتیں کرتے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے عقل کافی نہیں ہوسکتی۔ وہ تو نام ہی کے علی حزیں ہیں مگر ان کے پاس رہنے والا سچ مچ ہی حزیں (۲) ہوجاتا ہے کہ ہر وقت اسی فکر وغم میں رہے کہ دیکھئے اب سرکار کیا اشارہ کرتے ہیں۔

مسخرہ پن

علی حزیں مسخرہ بھی بہت تھا ایک بار دہلی میں کسی رئیس مکان کا کرایہ پر لیا۔ اس مکان کی دہلیز میں ایک مدار یا فقیر رہتا تھا جو نہ نماز کا نہ روزہ کا مگر صبح ہی اٹھ کر شجرہ بڑی زور زور سے پڑھا کرتا تھا۔ ایک بار مالک مکان نے آکر علی حزیں سے پوچھا آپ کو اس مکان میں کوئی تکلیف تو نہیں۔ کہنے لگا اور تو کوئی تکلیف نہیں مگر اس تذکرۃ الاولیاء سے کہہ دو کہ ذرا آہستہ پڑھا کرے۔ تو ظالم نے اسے کیا لقب دیا ہے تذکرۃ الاولیاء کیونکہ شجرہ میں بزرگوں کے بہت سے نام ہوا کرتے ہیں۔

فقہاء کا تفقہ

تو بلاتشبیہ حضرات فقہاء دربار نبوی کے رمضانی ہیں کہ حضور ﷺ کے لب ولہجہ سے مطلب نکال لیتے ہیں اشاروں کو سمجھتے ہیں اور دوسرے لوگ شاہ دہلی کے اس خادم کے مشابہ ہیں جو بدوں صاف صاف کہے مطلب نہیں سمجھتا تھا اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ فقہاء اور صوفیاء حکماء اسلام ہیں۔ ان کا وجود امت کے لیے رحمت ہے یہ حضرات اسرار شریعت کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ اب سمجھئے کہ فقہاء نے بیع کو تو شرط سے فاسد کہا اور نکاح کو اور اسی طرح ہبہ وصدقہ وغیرہ کو شرط فاسد سے فاسد نہیں کہا بلکہ خود شرط ہی کو باطل وکالعدم وغیر موثر قرار دیا۔ اس کی کیا وجہ ہے انہوں نے یہ فرق کہاں سے سمجھا اس کے لیے فقہاء کے پاؤں دھوؤ تب اس فرق کی سمجھ پیدا ہو۔ سو وہ فرق کو اس طرح سمجھے ہیں کہ انہوں نے یہ سوچا کہ نہی عن بیع وشرط کی علت کیا ہے کیونکہ احکام

(۱) غمگین۔

بالاستثناء احکام تعدیہ کے کسی علت سے معلل ہوتے ہیں۔ فقہاء اس علت پر نظر کر کے احکام منصوص سے غیر منصوص کی طرف متعدی کر لیتے ہیں۔ مگر مکرر تنبیہ کرتا ہوں کہ تعلیل کی اجازت وہیں ہے جہاں حکم تعبدی محض نہ ہو کیونکہ احکام تعبدیہ کا تعدیہ نہیں ہوتا بلکہ جو احکام تعبدی نہ ہوں ان کا تعدیہ ہوتا ہے اور وہیں تعلیل بھی جائز ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہہ دیا کہ کوئی عقلمند سب احکام میں تعلیل نہ کرنے لگے کہ نماز پانچ وقت فرض ہونے کی یہ علت ہے اور روزہ فرض ہونے کی یہ علت ہے وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہاں تعدیہ ہی نہیں لہٰذا تعلیل بھی جائز نہیں۔

بہرحال فقہاء نے نہی عن بیع و شرط کی علت کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بیع میں شرط اس لیے ممنوع ہے کہ اس میں معنی ربوا کے ہیں کیونکہ ثمن تو مبیع کے مقابلہ میں ہوگیا اور مبیع ثمن کے مقابلہ میں اور شرط کسی کے مقابلہ میں بھی نہیں اور احد العاقدین کو شرط سے نفع پہنچنا معلوم۔ تو یہ نفع کس چیز کے عوض میں لیا جارہا ہے ظاہر ہے کہ کسی کے عوض میں بھی نہیں۔ اس لیے یہ ربوا ہے لیکن یہ لزوم ربوا عقود معاوضہ میں تو ہوگا جیسے بیع و اجارہ وغیرہ اور نکاح میں نہیں ہوگا کیونکہ نکاح عقد معاوضہ ہی نہیں ہے گو صورۃ یہاں بھی معاوضہ ہے مگر اس کا معاوضہ بنانا مقصود نہیں ورنہ بدوں ذکر مہر کے نکاح ہی صحیح نہ ہوتا حالانکہ صحیح ہے خود نص میں موجود ہے۔ لَّا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً (۱) اس لیے یہاں شرط سے ربوا لازم نہ آئے گا۔ پس نکاح شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوگا بلکہ خود شرط ہی جو کہ منافی عقد ہو باطل ہوجائے گی چنانچہ اس مسئلہ میں عدم مقاربت کی شرط منافی عقد تھی اس واسطے باطل ہوئی اور اس کی مخالفت سے شوہر پر نہ گناہ ہوگا نہ کچھ ضمان ہوگا۔ ذرا لائیں تو آج کل کے محدثین یہ علوم، ہرگز نہیں! یہ کام فقہاء ہی کا ہے۔ الفاظ یاد کر لینے سے یہ علوم حاصل نہیں ہوتے۔ اس کے لیے مزاج شناس نبوت ہونے کی ضرورت ہے۔

(۱) ''تم پر کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لیے کچھ مہر مقرر کیا ہے'' سورۃ البقرہ:۲۳۶۔

اللہ کی عنایت

تو صاحبو! اگر عالم ارواح ہی میں ہم رہتے تو ہمارا وہ حال ہوتا جو اس شخص کا قبل استفتاء ہوا کہ نکاح کر کے بھی زیادت قرب سے محروم ہے۔ اسی طرح ہم بھی ایک حد پر رہتے۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکتے۔ اس کو سوچ کر عالم ارواح کا تصور کیا جائے تو وہاں کی زندگی وبال جان ہوجاتی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ یہاں بھیج کر اعمال سے زیادت قرب کا موقع دیا۔ ہاتھ پاؤں بھی دیئے جن سے نماز وروزہ ادا کر کے خدا تعالیٰ کی رضا اور محبت وقرب میں ترقی کر سکتے ہیں جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ کچھ روک ٹوک شاید آپ کہیں کہ عاشق کی تمنا کا اوپر ذکر ہوا ہے کہ وہ چاہتا ہے میں محبوب کو اور وہ مجھ کو لپٹے سو یہ قرب جو اعمال سے ہوا یہ تو ادھر سے لپٹنا ہوا مگر خدا کا لپٹنا کیسے ہوا۔ تو سمجھئے کہ لپٹنے میں ہوتا کیا ہے یہی تو ہوتا ہے کہ محبوب عاشق کو غایت قرب کے ساتھ اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے سو قرب تو اوپر ثابت ہوا۔ باقی احاطہ سو وہ بھی موجود ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (۱) یہ بڑی تسلی کی بات ہے اگر یہ نہ ہوتی تو عشاق کا دم ہی نکل جاتا۔ ان جذبات کو اہل عشق خوب سمجھتے ہیں۔ گو عشاق مجازی (۲) ہی ہوں نیز تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بھی اس معنی پر دال ہے بلکہ آیت سے بھی زیادہ دال ہے کیونکہ وہ احاطہ تکوینی کو بھی شامل ہے اور حدیث رضا میں نص ہے کیونکہ قرب بھی رضا ہے۔ گو اس میں احاطہ کی تصریح نہیں تو آیت سے احاطہ لیا جاوے اور حدیث سے رضا تو مجموعہ مدعا میں نص ہوگیا (۳)۔ بہرحال حق تعالیٰ آپ کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہیں۔ اس قرب میں تو وہ پہلے ہی سے قریب ہیں اور اعمال ذکر وغیرہ کے بعد پھر دوسرا قرب بھی میسر ہوجاتا ہے جس کا ادراک ذاتی طور پر آپ کو بھی ہوسکتا ہے۔ یہ تو ادھر سے تعلق ہوا اور آپ کی طرف سے تعلق یہ ہے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی (۴)

(۱) ''بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو محیط ہے'' سورۂ فصلت: ۵۴ (۲) چاہے کوئی مجازی عشق میں مبتلا ہو (۳) آیت میں اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ سب کو محیط یعنی احاطہ کئے ہوئے ہیں جس میں اس کی ذات بھی داخل ہے اور حدیث سے معلوم ہوا کہ اعمال ذریعہ قرب ہیں تو دونوں باتیں نص سے ثابت ہوگئیں (۴) ''محبوب حقیقی سے تھوڑی دیر بھی غفلت میں مت گزار، شاید وہ کسی وقت بھی نظر کرم کریں اور تو بے خبر ہو''۔

یعنی ہمیشہ احکام الٰہی پر نظر رکھی جائے اور ان کی یاد سے غافل نہ ہو۔ پھر جانبین سے قرب کی وہ کیفیت ہوگی جس کو اردو کا شاعر کہتا ہے

آرزو یہ ہے کہ نکلے دم تمہارے سامنے تم ہمارے سامنے ہو ہم تمہارے سامنے

آخرت میں قرب تام کا حصول

البتہ ظہور تام اس قرب کا اور اس سے تمتع کامل (۱) آخرت ہی میں ہوگا یعنی یہ قرب درمیان عبد و حق (۲) کے دنیا میں آکر ہوجاتا ہے جس میں باوجود اس کے کہ عالمِ ارواح سے بیشی ہے (۳) تاہم یہ کمی رہتی ہے کہ اس قرب سے تسلی کامل نہیں ہوتی اور آخرت میں اس سے پوری تسلی ہوجائے گی۔ یعنی ہر شخص کو اس کی تمنا کے موافق انکشاف (۴) میسر ہوگا کیونکہ تمنا کے موافق تحمل (۵) عطا ہوگا مگر یہ ضرور ہے کہ تمنا استعداد سے زیادہ نہ ہوگی اور یہی راز ہوگا تفاوت درجات قرب میں جس کی استعداد کا جتنا مقتضا ہوگا اُس قدر قرب اس کو عطا ہوجائے گا اور اسی وجہ سے ہر شخص کو تسلی ہوجائے گی۔ اور دنیا میں بوجہ حجب کے کچھ استتار رہتا ہے (۶) جس سے تمنا کے موافق انکشاف نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے تسلی میں کمی رہتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ لِيُوَفِّيَهُمْ

اہل کشف کی غلطی کا ازالہ

توفہ وزیادت اس معنی پر دلالت کے لیے کافی ہیں۔ نیز بلسان اہل جنت ارشاد ہے۔ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ (۷) نصب اور لغوب کی نفی بے چینی کی نفی کے لیے کافی ہے اور یہاں سے بعض اہل کشف کی ایک علمی غلطی معلوم ہوگئی ہوگی۔ گو عشاق کی غلطی بھی معاف ہے۔

گر خطا گوید و را خاطی مگوی ور شود پر خوں شہید آنراں مثنوی

خون شہیداں راز آب اولی ترست ایں خطا از صد ثواب اولی ترست (۸)

(۱) کامل لقع (۲) بندے اور اللہ میں قرب (۳) عالم ارواح کے مقابلے میں یہ قرب زیادہ ہے (۴) تمنا کے مطابق دیدار حق ہوگا (۵) قوت برداشت دیدی جائے گی (۶) ''تاکہ ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ دیں'' سورۂ فاطر: ۳۰ (۷) ''جہاں ہم کو نہ کوئی کلفت پہنچے گی اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہنچے گی۔'' سورہ فاطر: ۳۵ (۸) ''اگر غلطی کرے اس کو خطا وار مت کہو اگر شہید خون میں لت پت ہوجائے اس کو غسل مت دو کیونکہ شہیدوں کا خون آب حیات سے بہتر ہے اور یہ خطا سو ثوابوں سے بہتر ہے''۔

اس لیے ان پر ملامت نہ کرنا چاہئے گو رد جائز ہے۔ وہ غلطی یہ ہے کہ بعض عشاق نے یہ دعویٰ کیا ہے۔ ان فی الجنان جنۃ لیس فیھا حور ولا قصور ولکن فیھا ارنی ارنی (۱) اور اصل میں یہ ان کی کشفی غلطی ہے کہ ان کو اس سے آگے مکشوف نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ وہاں بعض عشاق کی یہ حالت کسی وقت ہو مگر بہت جلد تجلی سے ان کی تسلی کردی جائے گی۔ لوگ اس کو حدیث سمجھتے ہیں کیونکہ عربی عبارت ہے۔ بس آج کل جو مضمون عربی میں موجود ہو وہ حدیث ہی ہوتی ہے۔ ایک ظریف عالم نے خوب کہا ہے کہ بس تو عرب میں سب حدیثیں ہی حدیثیں ہوتی ہوں گی۔ کیونکہ وہاں تو ہر بات عربی میں ہے ان لوگوں کو اس تجلی سے تسلی کی اطلاع نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ سمجھ لیا کہ جنت میں جا کر بھی بے تابی ختم نہ ہوگی۔ پھر اس غلطی کی تائید ایک قیاس سے ہوگئی کہ اُنہوں نے جنت کی حالت کو یہاں کی حالت پر قیاس کرلیا۔ سو یہاں کی تو حالت یہ ہے کہ محبوب کا حسن تو بالفعل غیر متناہی ہے ہی مگر ہمارا عشق بھی غیر متناہی بمعنی لا یقف عند حد ہے کہ کسی درجہ پر بھی طلب ختم نہیں ہوتی۔ بس وہ حال رہتا ہے۔

نہ آیا وصل میں بھی چین ہم کو گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی
کنار بوس سے دونا ہوا عشق مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

تو اب یہ لوگ سمجھے کہ محبوب کا حسن تو آخرت میں بھی غیر متناہی ہوگا۔ اور ہمارا عشق بھی لا یقف عند حد ہے تو پھر وہاں چین کیسے آئے گا۔ میں کہتا ہوں کہ وہاں اس طرح چین آجائے گا کہ محبوب کا حسن تو غیر متناہی (۲) رہے گا مگر تمہارا عشق متناہی (۳) ہوجائے گا۔ یعنی جنت میں جا کر ایک حد پر ٹھہر جائے گا۔ اور جتنا قرب تمہاری استعداد کا مقتضا ہے (۴) وہ میسر ہوجائے گا اس لیے ہر شخص کو سیری اور آسودگی ہوجائے گی۔ تو

(۱) ''جنتوں میں سے ایک جنت ایسی ہے جس میں نہ حور ہے نہ محلات لیکن اس میں صرف ایسے لوگ آباد ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے اپنا دیدار کرادیجئے مجھے اپنا دیدار کرادیجئے اے اللہ رب العزت (۲) محبوب کے حسن کی تو کوئی انتہاء نہ ہوگی (۳) البتہ تمہارے عشق کی انتہاء ہوگی (۴) تمہارے اندر جتنے قرب کی برداشت کرنے کی طاقت ہوگی وہ عطاء ہوگا۔

یہ ایک مقدمہ ان کی نظر سے غائب رہا کہ جنت میں ہمارا عشق غیر متناہی بمعنی لا یقف عندحد نہیں رہے گا(۱)۔اس لیے ان کو جنت میں بھی بے چینی اور اضطراب کا شبہ ہوا۔ سوخوب سمجھ لو کہ جنت میں بے چینی ہرگز نہ ہوگی۔ وہاں سب کو چین آجائے گا۔ یہ بے چینی یہیں تک ہے۔

مفارقت دائمہ

بہرحال دنیا میں ہم کو اس لیے بھیجا گیا تا کہ اعمال کے ذریعہ سے قرب میں ترقی حاصل کریں ورنہ اصلی وطن ہمارا عالم ارواح ہے تو تعجب کی بات ہے کہ وطن غیر اصلی سے وطن اصلی کو جانا تو موت ہو اور وطن اصلی سے غیر اصلی کو آنا موت (۲) نہ ہو حالانکہ یہ معنیٔ اس سے بڑھ کر موت ہے۔ تو ثابت ہوگیا کہ ولادت ناسوتیہ معنیٔ موت (۳) ہے پھر ولادت کا ذکر اس کو موت سمجھ کر کیوں نہیں چھوڑا جاتا اور وفات کا ذکر اس کو ولادت سمجھ کر کیوں نہیں کیا جاتا۔ اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ اگر حیات موت ہے تو چاہئے کہ جب کوئی روح عالم ارواح سے دنیا میں آتی ہوگی تو شاید ارواح میں روتی ہوں گی کہ ہائے ایک عدد کم ہوگیا۔ جیسے یہاں کوئی جاتا ہے تو ہم لوگ روتے ہیں۔

اس کے چند جواب ہیں ایک تو یہ کہ یہاں کے ادراکات اور وہاں کے ادراکات میں فرق ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مرنے کے وقت جو ہم روتے ہیں تو موت سبب بکاء کا نہیں بلکہ وہ ظرف بکاء ہے یعنی سبب بکاء (۴) اور موت زماناً مقرن (۵) ہوگئے ہیں۔ سبب بکاء کا دوسری چیز ہے اور وہ مفارقت دائمہ کا گمان ہے (۶) اور دائمہ کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس عالم میں عود نہ کرے گا (۷) کیونکہ مطلق مفارقت سبب بکاء نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اگر کوئی ہمارا عزیز جلال آبا چلا جائے تو اس پر کوئی نہیں روتا۔ کیونکہ جانتے ہیں کہ ایک گھنٹہ میں واپس آجائے گا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

(۱) ہمارا عشق ایسا نہیں رہیگا جس کی کوئی حد نہ ہو (۲) عالم دنیا سے عالم ارواح میں جانا تو موت ہو اور عالم ارواح سے دنیا میں آنا موت نہ ہو (۳) پیدائش معنیٔ موت کے حکم میں ہے (۴) رونے کا سبب (۵) زمانے میں مل گئے (۶) ہمیشہ کی جدائی کا خیال (۷) اس دنیا میں واپس نہ آئے گا۔

وفات کے وقت تو لوگ روئے مگر معراج کے وقت کوئی نہیں رویا حالانکہ وہاں بھی مفارقت کے ساتھ انتقال الی الآخرت موجود تھا۔ کیونکہ آخرت کے دو جزو ہیں ایک زمان آخرت (۱) تو وہ بعد قیامت کے شروع ہوگا اور ایک مکان آخرت، وہ ابھی موجود ہے یعنی سموات۔ یہ شیخ ابن عربی کی تحقیق ہے۔

واقعہ معراج پر اشکال کا رد

اس تحقیق سے انہوں نے ایک اشکال کا جواب بھی دیا ہے وہ یہ کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں رویت حق تعالیٰ ہوئی ہے۔ اس پر اشکال ہوتا ہے کہ آخرت سے قبل رویت باری تعالیٰ کی ممتنع عادی ہے (۲) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے ہوئی۔ اس اشکال نے علماء کے دانت کھٹے کر دیئے کوئی اس کا جواب ایسا شافی نہیں دے سکا جیسا شیخ اکبر نے دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضور کو دنیا میں رویت نہیں ہوئی بلکہ آخرت میں ہوئی ہے اور آخرت کا جیسا ایک جزو زمان آخرت ہے ایک جزو اس کا مکان آخرت بھی ہے جو اس مکان دنیا سے مافوق ہے (۳)۔ معراج کے وقت آپ مکانا آخرت (۴) میں تھے۔ اس سے ساری گتھیاں کھل گئیں۔ بہرحال معراج میں باوجود انتقال الی الآخرت کے مفارقت کا کسی کو رنج نہیں ہوا کیونکہ مفارقت دائمہ نہ تھی۔ اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ معراج تو ایسے وقت ہوئی تھی کہ صحابہ میں سے کسی کو بھی اس مفارقت کا علم نہیں ہوا۔ اگر علم ہوتا تو شاید رنج بھی ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ معراج کی جب خبر ہوئی تھی اس وقت تو اس کے تصور سے رنج ہوتا۔ جیسے اگر کوئی مسکوت (۵) ہو کر پھر تندرست ہو جائے تو جن عزیزوں کو بعد صحت کے اس مرض کی اطلاع ہوگی ضرور اس کے تصور سے صدمہ ہوگا۔ اگر صحابہ کو ایسا ہوتا تو ضرور منقول ہوتا کیونکہ یہ سرسری بات نہ تھی اور رنج میں صرف مفارقت دائمہ کا موثر ہونا اور موت کا موثر نہ ہونا اس سے بھی متاید ہوتا ہے (۶) کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سچ

(۱) آخرت کا زمانہ (۲) عادۃ خدا کا دیدار نہیں ہوسکتا (۳) اس دنیا سے اوپر ہے (۴) معراج میں آپ مکان آخرت میں تھے جہاں دیدار خداوندی ممکن ہے (۵) بے ہوش ہو کر پھر ٹھیک ہو جائے (۶) تائید ہوتی ہے۔

مچ وصال ہوگیا تو منافقوں بددینوں میں کھچڑی پکنے لگی اور وہ باہم چپکے چپکے خوشیاں منانے لگے۔ حالانکہ خوشی کا کیا موقع تھا۔ بھلا اگر سلطان کسی منتظم کو اپنے پاس بلالے تو دوسرا منتظم بھیج دیا جاوے گا جو اشرار کی (۱) سرکوبی کے لیے کافی ہوگا۔ گورتبہ میں کم ہو۔

حضرت عمرؓ کا حال

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت تلوار نکال کر سب کو دھمکایا خبردار کوئی شخص زبان سے یہ لفظ نہ نکالے کہ حضور کی وفات ہوگئی بلکہ آپ پر غشی طاری ہوگئی اور درگاہ قرب میں روحانی طور پر تشریف لے گئے ہیں۔ ابھی واپس آکر منافقوں کو قتل کریں گے، حضور کی وفات ابھی نہیں ہوسکتی جب تک کہ اسلام کی تکمیل نہ ہوجائے۔ یہ کوئی پالیسی نہیں تھی جیسا کہ بعض اہل ظاہر کا خیال ہے بلکہ واقعی اس وقت حضرت عمرؓ کا خیال ہی یہ تھا کہ یہ حالت جو حضور پر طاری ہے موت نہیں ہے بلکہ آپ کو معراج روحانی ہوئی ہے۔ اگر ان کو یہ شبہ ہوتا کہ یہ حالت موت ہے ان کو اپنے بھی ہوش نہ رہتے۔ چہ جائیکہ پالیسی اور تدبیر سوچتے۔ چنانچہ جس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبان سے ان کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ حضور کا وصال ہوچکا اس وقت ان سے کھڑا بھی نہ ہوا گیا۔ قدم لڑکھڑا گئے اور سکتہ کی حالت میں رہ گئے بھلا عاشق کو محبوب کی مفارقت کے وقت کہیں پالیسی کی سوجھتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ حقیقتاً ان کا خیال یہ تھا کہ حضور دین کی تکمیل فرما کر دنیا سے تشریف لے جائیں گے۔

اشکال کا جواب

اس پر شاید اہل علم کو یہ شبہ ہو کہ دین کی تکمیل تو حضور ﷺ کے سامنے ہوچکی تھی چنانچہ حج وداع میں آیت: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (۲) نازل ہوچکی تھی، پھر حضرت عمرؓ کو کس تکمیل کا انتظار تھا۔ جواب یہ ہے کہ آیت میں جس تکمیل کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ احکام کے

(۱) شرارتیوں کو ٹھیک کرنے کے لیے کافی ہوگا (۲) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کردیا اور میں نے تم پر انعام تام کردیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کرلیا'' سورۃ المائدہ: ۳۔

اصول وقواعد ہر بات میں مکمل ہو چکے، ایسے ایسے قاعدہ بتلا دیئے گئے کہ اب قیامت تک کے واقعات کا حکم انہیں سے معلوم ہوسکتا ہے اور حقیقی تکمیلِ اسلام یہی ہے بھی، مگر حضرت عمر کا خیال یہ تھا کہ فروعی تکمیل بھی حضور ہی کے ہاتھوں سے ہوگی جس کے بعد کسی کے اجتہاد کی ضرورت نہ رہے گی۔ جیسا مسئلہ ربوا میں تبیین کامل منصوص (۱) کی تمنا ان سے منقول ہے۔ یا اشاعت اسلام کی تکمیل بھی آپ ہی کے ہاتھوں ہوگی۔ جس کی صورت یہ ہے کہ تمام عالم کی فتوحات آپ کے سامنے ہوں۔ جیسا ان کا یہ قول وارد ہے کہ جب تک منافقین کے ہاتھ پاؤں نہ کاٹیں گے آپ کی وفات نہ ہوگی۔ گو اصولاً یہ تکمیل بھی ہو چکی تھی کیونکہ حضور ﷺ نے اس کا نقشہ بھی صحابہ کو بتلا دیا تھا کہ اوّل شام کی طرف پیش قدمی کرنا، پھر فارس کی طرف۔ چنانچہ مرض وفات ہی میں جیش اسامہ کو تیار فرما کر شام کی طرف جانے کا حکم فرمایا تھا اور کنوز کسریٰ وخزائن فارس کے فتح ہونے کی پیشین گوئی صحابہ سے کئی بار فرمائی۔ تو اصولاً فتوحات کی بھی تکمیل آپ فرما چکے تھے۔ صرف اتنی دیر تھی جیسے انجینئر اعظم نہر کھدوا کر لیول درست کردے اور تمام مقامات سے اس کو ہموار کر کے چلا جائے کہ اب صرف اتنا کام باقی ہے کہ اس میں پانی چھوڑ دیا جائے۔ سو یہ کچھ کمی نہیں محض ظاہری کمی ہے حقیقت میں تو نہر کا کام ختم ہوگیا اسی طرح حضور ﷺ فتوحات کا کام بھی حقیقت میں ختم فرما چکے تھے۔ نقشہ سب تیار ہو چکا تھا صرف فوجوں کا اس پر چلانا باقی تھا سو یہ کچھ کمی نہیں تھی، مگر حضرت عمر کا خیال یہ تھا کہ یہ ظاہری کمی بھی حضور ہی کے سامنے پوری ہوگی (یہ خبر نہ تھی کہ یہ کام میرے ہی ہاتھوں سے خدا تعالیٰ کو لینا منظور ہے اور مجھے فاتح اعظمِ اسلام کا لقب دینا ہے)۔

غرض جب تک حضرت عمرؓ کا یہ خیال رہا کہ آپ کو معراج روحانی ہوئی ہے اس وقت سنبھلے رہے۔ نہ رونا آیا نہ رنج وفکر ہوا بلکہ دلیری کے ساتھ منافقوں کو دھمکاتے رہے۔

صدیق اکبرؓ کا تحمل وثابت قدمی

یہاں تک کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی اس حالت کی

(۱) جیسے حضرت عمر سے مسئلہ سود میں واضح حکم نازل ہونے کی تمنا منقول ہے۔

اطلاع ہوئی وہ اس وقت اپنے گھر میں تھے کیونکہ صبح کی نماز کے وقت وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اچھا دیکھ گئے تھے کہ نماز کے وقت آپ بستر سے اٹھ کر دروازہ مکان تک بھی تشریف لائے جس سے صحابہ کو گمان ہوا کہ شاید آپ نماز کے لیے تشریف لانا چاہتے ہیں اور اس خوشی میں قریب تھا کہ نماز درہم برہم ہوجائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پردہ چھوڑ کر پھر بستر پر تشریف لے آئے۔ اس حالت کو دیکھ کر گمان نہ ہوتا تھا کہ آپ کا آج ہی وصال ہوجائے گا۔ اس لیے حضرت صدیقؓ بے فکر ہوکر کسی ضرورت سے مکان پر چلے گئے کہ پیچھے آپ پر حالت نزع طاری ہوگئی اور وصال ہوگیا) یہ خبر سن کر حضرت صدیق جلدی سے تشریف لائے تو مسجد میں صحابہ کو حیران و پریشان اور حضرت عمر کو یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ خبردار! حضور کی نسبت وفات کا لفظ کسی کی زبان سے نہ نکلنے پائے ورنہ اس تلوار سے دو ٹکڑے کردوں گا۔ حضرت صدیق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کی بات پر التفات نہ کیا اور سیدھے حجرہ عائشہ صدیقہ میں تشریف لے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ اطہر سے چادر مبارک کھول کر حضور کو دیکھا تو دیکھتے ہی یقین آگیا کہ حضور کا وصال ہوگیا۔ اس وقت سب سے زیادہ حضرت صدیق مضبوط رہے کہ وفات کا یقین ہوجانے کے بعد اتنا تو منہ سے نکلا۔ واخلیلاہ واحبیباہ طبت حیاو میتاو اللّٰہ لا یجمعن اللّٰہ علیک موتین ابداامالموتہ التی کتب علیکف قد تمھا[۱]۔

اس کے بعد نہایت ضبط کے ساتھ حجرہ سے باہر آئے۔ اس وقت صحابہ کی عجیب حالت تھی کہ سب کے سب حضرت صدیق کے منہ کو تکتے تھے کہ دیکھئے ان کے منہ سے کیا نکلتا ہے۔ حضرت صدیقؓ نے اول تو حضرت عمر کو پکار کر فرمایا علی رسلک یار جل۔ اے شخص ٹھہر جا خاموش ہوجا۔ مگر حضرت عمر جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ خاموش نہ ہوئے تو حضرت صدیق سیدھے ممبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ پڑھا۔ اس وقت سب صحابہ حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر حضرت صدیقؓ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ تو آپ نے حمد وصلوۃ کے بعد فرمایا۔ اما بعد فمن کان یعبد محمدا فان محمدا قدمات و من کان یعبد

(۱) ”واخلیل، واحبیب آپ کی حیات و ممات دونوں احسن ہیں اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ کبھی بھی دو موتیں آپ پر جمع نہیں کرے گا ایک موت جو آنی تھی وہ آچکی۔

اللّٰہ فان اللّٰہ حیی لا یموت (۱)

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ ٱلرُّسُلُ ۚ أَفَإِيْن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ ٱنقَلَبْتُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَٰبِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ ٱللَّهَ شَيْـًٔا ۗ وَسَيَجْزِى ٱللَّهُ ٱلشَّٰكِرِينَ (۲)

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ عِندَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ (۳) یعنی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معبود سمجھتا ہو وہ سن لے کہ حضور کا تو وصال ہو چکا اور جو خدا کی عبادت کرتا ہو (اور یہی سمجھ کر اسلام لایا ہو) تو حق تعالیٰ زندہ ہیں وہ کبھی نہ مریں گے۔ اس میں بتلادیا کہ تکمیل اسلام کے لیے حق تعالیٰ کا حی لا یموت ہونا کافی ہے۔ حضور کے زندہ رہنے کی ضرورت نہیں۔ بس یہ سن کر حضرت عمرؓ بالکل ٹھنڈے ہو گئے اور اب اتنی بھی طاقت نہ رہی کہ کھڑے رہ سکیں۔ ایک آہ بھر کر تلوار کے سہارے سے بیٹھ گئے۔

سو بتلایئے! حضرت عمر کو یہ صدمہ پہلے کیوں نہ ہوا حالانکہ معراج روحانی میں بھی مفارقت موجود تھی اور وہ بھی بالکل مشابہ موت کے تھی اب کیوں صدمہ ہوا تو بات یہ ہے کہ پہلے تو یہ خیال تھا کہ مفارقت (۴) دائمہ نہیں۔ تھوڑی دیر کی ہے ابھی حضور تشریف لے آئیں گے اور اب یقین ہو گیا کہ حضور اب دنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔ جو گویا بمنزلہ مفارقت دائمہ کے ہے۔ اس لیے رنج ہوا پس ثابت ہو گیا کہ اصل سبب رنج کا موت نہیں بلکہ مفارقت دائمہ ہے۔

سرکار دو جہاں کی پسند

ورنہ موت تو اصل میں معنی حیات (۵) ہی ہے اور اس سبب کی تعیین سے یہ شبہ بھی دفع ہو گیا کہ جب تمہارے قول کے مطابق موت بھی حیات ہی ہے اور فی نفسہ موت کو حیات پر ترجیح ہے تو پھر صحابہ کو آپ کے وصال سے رنج کیوں ہوا۔ خوش ہونا چاہئے تھا کہ حضور کو افضل حالت نصیب ہوئی۔ وجہ دفع اوپر کی تقریر سے ظاہر ہے کہ

(۱) الصحیح للبخاری ۱/۲۶، ۵: ۴، مسند الامام أحمد ۳/۱۸، کنز العمال ۳۲۵۹۰، فتح الباری لابن حجر: ۱/۵۸۸، ۷/۱۲ (۲) سورۃ آل عمران: ۱۴۴ (۳) سورۃ الزمر ۳۰۔۳۱ (۴) ہمیشہ کی جدائی نہیں (۵) زندگی۔

صحابہ کو رنج اس لیے ہوا تھا کہ وہ حضور کے وصال کو حیات سے افضل نہ سمجھتے تھے اس کی تو صحابہ سے تصریح ہے جو عنقریب آتی ہے بلکہ رنج اس کا تھا کہ حضور ہم سے جدا ہو گئے اور آپ کی برکات ہم سے منقطع ہو گئیں۔ چنانچہ (مسلم میں ہے) ایک بار حضرات شیخین حضور کے وصال کے قریب ہی حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کی زیارت کو گئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلانے والی پالنے والی تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ملنے کو گاہے گاہے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اسی سنت کے مطابق حضرات شیخین بھی تشریف لے گئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کر کے رونے لگیں۔ حضرات شیخین نے فرمایا، اے ام ایمن! کیوں روتی ہو! کیا تم کو معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ کے پاس کی نعمتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے (دنیا سے) بہتر ہیں (یہ فرمانا کیا تم کو معلوم نہیں اپنے فرمان سے بتلا رہا ہے کہ یہ صحابہ کے نزدیک اولیات ومسلمات میں سے تھا) اس پر انہوں نے فرمایا یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔

ولکن الوحی انقطع عنا لیکن حضور کے تشریف لے جانے سے نزول وحی منقطع ہو گیا(۱) اس لیے روتی ہوں۔ یہ وہی بات تھی کہ رنج اس کا ہے کہ ہم حضور سے جدا ہو گئے یا حضور ہم سے جدا ہو گئے اور وہ برکات نبوت منقطع ہو گئیں۔ فبکیٰ لذلك الشیخان یہ سن کر حضرات شیخین بھی رونے لگے۔

یہاں اہل ظاہر کو شبہ ہوگا کہ یہ حضرات کیوں رونے لگے۔ یا تو ان کو بھی رونے سے منع کرتے تھے یا خود بھی رونے لگے۔ صاحبو! یہ رونا بھی ان کے محقق ہونے کی دلیل ہے حضرات صحابہ عارف تھے اور عارف بھی کامل اور عارف کامل کا قاعدہ ہے کہ وہ ہر چیز کا حق ادا کرتا ہے عقل کا بھی طبع کا بھی، تو حضرات شیخین نے اول تو عقل کا حق ادا کیا کہ عقلاً عاشق کو محبوب کے لیے وہی بات پسند کرنا چاہئے جس کو محبوب خود پسند کرتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرت ہی محبوب تھی چنانچہ (حدیث متفق علیہ میں ہے کہ) وصال سے پہلے ایک بار حضور نے فرمایا۔ ان اللہ خیر عبدا بین الدنیا وبین ماعندہ فاختار ماعند اللہ فبکیٰ ابوبکر وقال لفدیك بابائنا واماتنہا یارسول اللہ (۲)

(۱) وحی نازل ہونی بند ہو گئی (۲) المعجم الکبیر للطبرانی: ۳/ ۱۴۰، اتحاف السادۃ المتقین: ۱۰/ ۲۹۴، ۲۹۶۔

یعنی حق تعالیٰ نے ایک بندہ کو اختیار دیا ہے کہ چاہے دنیا میں رہیں یا خدا تعالیٰ کے پاس جائیں تو اس بندہ نے خدا تعالیٰ کے پاس جانا پسند کیا۔ حضرات صحابہ اس کا مطلب نہ سمجھے یہ خیال کیا کہ حضور کسی اور شخص کا قصہ بیان فرمارہے ہیں مگر حضرت ابوبکر صدیق سمجھ گئے کہ حضور اپنا ہی واقعہ بیان فرمارہے ہیں۔ وہ رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے باپ ماں آپ پر قربان ہیں صحابہ اس قصہ میں فرماتے ہیں فکان ابوبکر اعلمنا ابوبکر ہم میں سب سے زیادہ عالم تھے کہ وہ مطلب سمجھ گئے۔ اس سے صراحۃً معلوم ہوا کہ حضور کو آخرت پسند تھیں۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں جن میں یہ امر مصرح ہے(۱) چانچہ بیہقی کی حدیث میں ہے جب وقت وصال کا وقت قریب آیا تو حضرت عزرائیل علیہ السلام ملک الموت نے عرض کیا کہ مجھے حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ بدوں آپ کی اجازت کے کچھ نہ کروں۔ فنظر الی جبرئیل فقال یامحمد ان اللّٰہ قد اشتاق الی لقائك فقال امض لما امرت به(۲)

یعنی اس وقت حضور نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف نظر کی (کہ بتلاؤ میں کونسی حالت اختیار کروں) انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! حق تعالیٰ آپ کے ملنے کے مشتاق ہیں۔ اس کے معنی میں بیہقی نے کہا ہے۔ قدار ادلقائك بان یرد ك من دنیاك الی معادك زیادۃ فی قربك و کرامت تو آپ نے فرمایا بسم اللہ! اے عزرائیل! اپنا کام شروع کرو (کہ مجھے بھی اپنے پروردگار کے لقاء کا اشتیاق ہے) نیز عین وصال کے وقت آپ یہ فرمارہے تھے۔ اللھم الرفیق الاعلیٰ اور یہ بھی فرمارہے تھے۔ مع الذین انعمت علیھم من النبیین و الصدیقین و الشھداء و الصالحین (۳) یعنی اے اللہ! میں رفیق اعلیٰ کو تلاش کرتا ہوں جہاں ان لوگوں کا ساتھ ہوگا۔ جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ سن کر میں نے سمجھ لیا کہ حضور کو اس وقت اختیار دیا گیا تھا اور آپ نے رفیق اعلیٰ کو پسند فرمایا۔ فاذا الا یختار نا (۴) بس اب ہمارے پاس رہنا آپ کو منظور نہیں۔

---

(۱) یہ بات واضح ہے (۲) الصحیح للبخاری ۶/۱۸، ۱۹، ۸/۹۴، ۱۳۳، الصحیح لمسلم: ۱۸۹۴، مسند الامام أحمد: ۶/۸۹، المغنی عن حمل الاسفار للعراقی: ۴/۱۵۸، اتحاف السادۃ المتقین: ۹/۲۱۰، ۱۰/۲۸۸ (۳) رواہ الشیخان (۴) رواہ الشیخان۔

طبعی تقاضا

یہاں سے موت کی ایک وجہ ترجیح علاوہ وجوہ مذکورہ بالا یہ بھی نکل آئی کہ حضور کو یہ حالت محبوب تھی۔ اگر حیات کو ترجیح ہوتی تو حضور راجح کو اختیار فرماتے۔ اور جب آپ کو یہ حالت محبوب تھی تو عاشق حقیقی بھی عقلاً آپ کے سفر آخرت کو محبوب سمجھے گا اسی لیے اول تو شیخین نے ام ایمن سے یہی فرمایا کہ۔ ماعنداللّٰہ خیرلرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم(۱)

پھر جب انہوں نے اپنے بکا کی یہ وجہ بیان کی کہ ہم سے وحی منقطع ہوگئی جس کا حاصل مفارقت پر صدمہ ہے خواہ مفارقت ذات کہو یا مفارقت برکات (۲) دونوں کا ایک ہی حاصل ہے کیونکہ برکات بھی تو ذات ہی کے ساتھ ہیں۔ تو یہ حضرات بھی رونے لگے تو اب طبیعت کا حق ادا کیا کیونکہ طبعی اقتضاء یہ ہے کہ اس مفارقت دائمہ ظاہرہ سے جو حقیقت میں غیر دائمہ ہے کچھ آنسو ٹپک پڑیں عارف کامل سب حقائق کا حق ادا کرتا ہے۔

عارف کی شان

حضرت عمرؓ کا قصہ ہے کہ ایک بار آپ بیمار تھے کسی نے مزاج پوچھا فرمایا طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اس نے عرض کیا اے امیرالمؤمنین! کیا آپ شکایت کرتے ہیں؟ فرمایا سبحان اللہ! تو کیا میں خدا کے سامنے بہادر بنوں کہ وہ تو مجھے بیمار کریں اور میں کہوں نہیں میں تو تندرست اچھا خاصا ہوں۔ آج کل لوگ بزرگ اسی کو سمجھتے ہیں کہ اس پر چاہے کچھ ہی گزر جائے مگر زبان سے یوں ہی کہتا رہے کہ ہم اچھے ہیں۔ یہ غلطی ہے عارف وہ ہے کہ جب حق تعالیٰ اس کو ناتوانی دیں تو اپنا عجز ظاہر کرے جیسے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ایک بار وہ بیٹھے رو رہے تھے کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا بھوک لگ رہی ہے اس نے کہا آپ کیا بچہ ہیں جو بچوں کی طرح بھوک سے رونے لگے۔ فرمایا: ارے بے وقوف اور اگر محبوب نے مجھے بھوک اسی واسطے لگائی ہو کہ میرا رونا دیکھیں تو پھر کیوں نہ روؤں۔

(۱) خداتعالیٰ کے پاس نعمتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دنیا سے بہتر ہیں (۲) ذات کی جدائی یا برکات کی جدائی۔

موت پر رنج طبعی کی وجہ

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھو کہ حق تعالیٰ نے جو اپنے بندوں کو حقائق دیئے ہیں ان میں جہاں ایک عقل دی ہے وہاں ایک اور چیز بھی دی ہے جس کا نام طبیعت ہے اور ہر چیز کے جدا مقتضیات ہیں (۱)۔ عقل کا تو مقتضا یہ ہے کہ محبوب کو جو چیز پسند ہو ہم بھی اس کو پسند کریں اور طبیعت کا مقتضا یہ ہے کہ اس مفارقت عارضہ (۲) سے جو بشکل مفارقت دائمہ کے ہے کچھ دو چار آنسو بھی بہہ جائیں۔ اور یہ جو قید لگائی بشکل مفارقت دائمہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مفارقت عارضہ تو ایسی ہے جو حقیقت میں بھی عارضہ ہے اور شکل میں بھی عارضہ ہے جیسے کوئی جلال آباد چلا جائے اور ایک مفارقت عارضہ وہ ہے جو شکلاً دائمہ ہو وہ موت ہے۔ اس کا مقتضا طبعی یہی ہے کہ کچھ حزن عارض ہو اور میں نے دائمہ کی تفسیر اوپر کی تھی کہ اس کے عود کرنے سے مایوسی (۳) ہو۔

اس سے ایک شبہ کا رفع کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ گو میت تو ہمارے پاس نہیں آتی مگر ہم تو مر کر اس عالم میں جانے والے ہیں پھر مفارقت دائمہ کہاں ہوئی خصوصًا حضرات صحابہ اور ان میں سے خصوص مبشرین بالجنۃ (۴) کہ ان کا اجتماع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ یقینی ہے، پھر ان کو کیوں رنج ہوا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی صاحبزادی کی وفات پر کیوں رنج ہوا؟۔

سو اس قید سے جواب نکل آیا کہ اللہ تعالیٰ نے طبیعت کی ایسی ہی خاصیت بنائی ہے کہ باوجود تیقن اجتماع (۵) کے جب عدم عود الی ہذا العالم معلوم ہو جائے ضرور حزن (۶) ہوتا ہے اور یہ ایسا امر طبعی ہے کہ اگر کوئی دوسری کیفیت اس پر غالب آ جاوے تو خیر ورنہ یہ اپنا اثر ضرور کرتی ہے۔

---

(۱) ہر چیز کے تقاضے مختلف ہیں (۲) اس عارضی جدائی سے جو شکل کے اعتبار سے دائمی ہے (۳) اس کے واپس آنے کی امید نہ ہو (۴) جن کو جنت کی بشارت دی گئی تھی (۵) جمع ہونے کے یقین کے باوجود جب اس دنیا میں واپس نہ آنا معلوم ہو جائے تو غم ضرور ہوتا ہے۔

حضرت فاطمہؓ کی معرفت

جیسا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ حدیث میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور کے مرض وفات میں مزاج پرسی کے لیے تشریف لائیں۔ فسارھا فبکت فلما رای حزنھا سارھا الثانیۃ فضحکت۔

یعنی حضور نے خفیہ طور سے کوئی بات ان سے کہی تو وہ رونے لگیں۔ پھر دوبارہ کوئی بات چپکے سے فرمائی تو ہنسنے لگیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں مجھ کو تعجب ہوا کہ ایک ہی جلسہ میں روتی بھی ہیں ہنستی بھی ہیں۔ ان کو کیا ہوگیا اور فرماتی ہیں کہ مجھے خیال ہوا کہ میں تو فاطمہ کو ایک بڑی عاقلہ جانتی تھی یہ تو معمولی عورت نکلیں۔ پھر دوسرے وقت اس کا سبب پوچھا کہ تم ایک ہی جلسہ میں روتی اور ہنستی کیوں تھیں۔ تو انہوں نے فرمایا یہ حضور کا ایک راز ہے جس کو میں ظاہر نہیں کرسکتی۔ حضرت عائشہ نے حضور ﷺ کے وصال کے بعد پھر دریافت فرمایا تو حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ ہاں اب بتلانے میں کوئی عذر نہیں۔ بات یہ ہے کہ حضور نے اول تو مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام ہر رمضان میں مجھ سے ایک بار قرآن کا دور کرتے تھے۔ اس سال دو مرتبہ کیا ہے۔ اس کو میں سمجھتا ہوں کہ میرا وقت قریب آگیا ہے۔ یہ سن کر تو میں رونے لگی۔ اس پر دوسری دفعہ آپ نے فرمایا اے فاطمہ میرے متعلقین میں سب سے پہلے تم میرے پاس آؤ گی یہ سن کر میں ہنسنے لگی (۱)۔

سو اول مفارقت دائمہ سے رونا آیا گو یہ معلوم تھا کہ مفارقت دائمہ اس معنی کو نہیں ہے کہ میں اس عالم میں جمع نہ ہوں گی۔ مگر پھر بھی رنج ہوا مگر جب حضرت فاطمہ کو معلوم ہوگیا کہ سب سے پہلے آپ کے پاس میں پہنچوں گی تو اس وقت اُس کا ایسا غلبہ ہوا کہ باوجود بقاء مقتضی غم کے سارا غم دھل گیا اور اس لا یعود الینا (۲) پر نعود الیہ (۳) غالب آگیا۔ نیز ممکن ہے کہ حضور ﷺ کی مرضی پاکر کہ آپ غم کو زائل کرنا چاہتے ہیں قصداً مسرت ظاہر کی ہو کیونکہ حضور نے یہ دوسری خبر اس واسطے سنائی تھی تاکہ ان کا غم زئل

(۱) رواح الشیخان (۲) ہمارے پاس واپس نہ آئیں پر (۳) ان کے پاس لوٹیں گے۔

ہو اور خوش ہوں۔ پھر اس پر خوشی کیوں کر ظاہر نہ کرتیں اور یہ ان کے بڑے عاشق ہونے کی دلیل ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں محققین۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک برفرق قناعت بعد ازیں (۱)

اور اس طرح دلیل ہے کہ باوجود طبیعت پر خبر اول سے غم طاری ہونے کے فوراً ہی دوسری خبر کا بھی حق ادا کیا اور یہ سمجھا کہ حضور نے اس خبر سے مجھے مسرور کرنا چاہا ہے تو مجھے مسرت ظاہر کرنا چاہئے تاکہ حضور ﷺ کا مدعا حاصل ہوجائے اور آپ کو اطمینان ہوجائے کہ لخت جگر کا غم ٹل گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مفارقت عارضہ بشکل مفارقت دائمہ (۲) کا طبعی مقتضی یہ ہے کہ اس پر کچھ حزن (۳) ضرور ہو۔ خدا تعالیٰ نے ہر چیز میں ایک خاصیت رکھی ہے۔ اس مفارقت دائمہ میں یہی خاصیت ہے کہ اس سے آدمی بے چین ہوجائے اور دو چار آنسو نکل پڑیں۔ پس عارف وہ ہے جو اس کا بھی اثر لے اور عقل کا بھی یعنی بواسطہ عقل کے تو راضی رہے اور طبیعت سے رنجیدہ ہو۔

عارفین کی حالت

اسی لیے کہتے ہیں کہ محقق جامع اضداد (۴) ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ اضداد صوریہ (۵) کو جمع کر دیتا ہے۔ اضداد حقیقیہ مراد نہیں۔ اسی کو کہتے ہیں۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسنا کے نداند جام وسندان باختن (۶)

عارف کی حالت اس وقت یہ ہوتی ہے کہ آنکھ رو رہی ہے اور قلب ہنس رہا ہے۔ کوئی جو ایسا کر سکے۔ حضور ﷺ نے ایسا کر کے دکھا دیا اور آپ کے وارثوں نے بھی اس پر عمل کیا ہے۔ جس وقت حضور ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا وصال ہونے لگا تو آپ کی آنکھ سے آنسو جاری تھے اور زبان سے بھی حزن (۷) کا اظہار

(۱) ''اگر بادشاہ دین ہی طمع کے خواہشمند ہوں تو پھر قناعت کے سر پر خاک'' (۲) عارضی جدائی جو بشکل دائمی جدائی ہو (۳) اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر کچھ غم ہو (۴) متضاد باتوں کو جمع کرنے والا (۵) یعنی جو صورۃ ایک دوسرے سے جدا ہوں حقیقتاً مراد نہیں (۶) ''ایک ہاتھ میں شریعت کا دوسرے میں عشق کا جام ہو ہوسناک دونوں کے ساتھ بیک وقت نمٹنا نہیں جانتا'' (۷) غم۔

فرمارہے تھے۔ دل غمگین بھی تھا اور ساتھ ہی راضی بقضاء اللہ بھی تھا۔ چنانچہ حدیث میں حضور کے یہ الفاظ وارد ہیں۔ العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا مایرضی ربنا وانابفراقك یاابراھیم لمحزونون (۱) یعنی گو دل غمگین ہے اور آنکھ بہہ رہی ہے مگر ہم کہیں گے وہی بات جو حق تعالیٰ کو پسند ہے۔ اب بھی بعضے اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں جو دونوں کا حق ادا کرتے ہیں۔

کاملین کی پہچان

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کا مکان گر پڑا، رنج بھی ہوا۔ پھر قہقہہ مار کر ہنسے کہ اب ہم کہاں رہیں گے۔ اس میں خدا تعالیٰ کے فعل پر رضا کا اظہار تھا کہ وہ پریشان کر کے تھوڑی دیر نچانا چاہتے ہیں تو ہم کو اس پر بھی راضی رہنا چاہئے۔ یہ تو اہل مقام حضرات ہیں اور بعض اہل حال ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے کسی عزیز کی موت پر مطلق نہیں روئے بلکہ ہنس دیئے مگر وہ ہمارے مدرسہ سلوک کے مڈل پاس ہیں۔ بی اے نہیں۔ گو آپ تو شاید یہی کہیں گے کہ بڑا کامل ہے مگر حقیقت میں وہ بڑا کاہل ہے کہ رویا بھی نہیں ارے جب حق تعالیٰ رلانا چاہتے ہیں تو دو آنسو بہانا چاہئیں تھے وہ حال کے زوال کے بعد بھی اپنی رائے سے یہ سمجھتے ہیں کہ ایک کا تو حق ادا کر دیا یعنی محبتِ حق کا کہ خدا کے فعل پر راضی رہے اب اگر طبیعت کا حق بھی ادا کریں اور رونے لگیں تو اس سے دوسرا حق فوت ہوجائے گا۔ حالانکہ یہ غلطی ہے دونوں کا حق ساتھ ساتھ ادا ہوسکتا ہے۔ اس طرح کہ طبعاً رنج کرو اور عقلاً راضی رہو۔ اس میں خدا تعالیٰ کی محبت اور مخلوق کی محبت کہ اس محبت کا حق بھی خدا تعالیٰ ہی نے بنایا بھی ہے بتایا بھی ہے۔ دونوں کا حق ادا ہوگیا یہ حالت کامل ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے واقعہ میں روئے ہیں اور حضرات صحابہ بھی روئے ہیں جو انبیاء کے بعد اکمل الناس ہیں۔

سوال کا جواب

اور جب ثابت ہوگیا کہ یہ اثر حزن وغیرہ مفارقت دائمہ (۱) بالتفسیر السابق کا

(۱) کنز العمال: ۴۲۴۸۳، ۴۲۸۹۸، تلخیص الحبیر لابن حجر ۲/۱۳۹، الطبقات الکبری لابن سعد: ۱۔۱/۸۹
(۲) یہ غم کا اثر ہمیشہ کی جدائی جس کی تفسیر ابھی ذکر کی ہے کا ہے۔

ہے تو یہاں سے اعتراض کے اس جواب کی تفصیل بھی ہوگئی جو ذرا اوپر مذکور ہوا تھا کہ اگر ولادت صوریہ موت ہے عالم ارواح کے اعتبار سے تو چاہئے جب کوئی روح دنیا میں آوے تو عالم ارواح میں شوروشیون (۱) برپا ہوجاوے۔ وجہ جواب ظاہر ہے کہ یہاں کی موت کے وقت تو ہمارا یہ ادراک ہے کہ لا یعود الینا(۲) اور وہاں کی موت کے وقت جو کہ کسی روح کا دنیا میں آنا ہے ارواح کا ادراک یہ ہے کہ یعود الینا یعنی پھر ہمارے پاس آجاوے گا اس لیے ان کو رنج نہیں ہوتا۔ مگر باوجود اس کے چونکہ یہ بھی احتمال ہے کہ شاید ہمارے پاس نہ آوے اس احتمال کے غم میں اتنا اثر ہوتا ہے کہ جب کوئی روح بعد موت اس عالم میں بخیریت پہنچتی ہے تو ارواح بے حد مسرور (۳) ہوتی ہیں۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے، تو یہ فرحت بتلا رہی ہے کہ اس کے قبل کچھ کلفت تھی۔ یہ اثر تو احتمال کا تھا اور اگر کبھی یہ احتمال واقع اور محقق ہوجاتا ہے تو پھر وہ کلفت ظاہر ہوجاتی ہے۔

چنانچہ حدیثوں میں ہے کہ آنے والی روح سے اگر کسی کا مرنا سنتی ہیں جو ان کے پاس نہیں پہنچا تو افسوس کرتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے دوزخ میں گیا۔ البتہ اس افسوس میں یہاں کا سا رنج نہیں ہوتا یعنی عالم ارواح میں مفارقت کا رنج اتنا نہیں ہوتا جتنا یہاں کی موت سے مفارقت کا رنج ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ عالم ارواح میں طبیعت حاکم نہیں، یہاں طبیعت حاکم ہے اور یہ دوسرا جواب ہے اس شبہ کا اگر حیات موت ہے تو چاہئے کہ جب کوئی روح دنیا میں آتی ہوگی، تو شاید یہ ارواح بھی روتی ہوں گی جیسے یہاں سے کسی کے مرنے پر ہم لوگ روتے ہیں۔

بہرحال اس تقریر سے سب شبہات رفع ہوگئے اور مدعا ثابت ہوگیا کہ یہ حیات دنیویہ معنی موت ہے تو پھر یہاں کی موت وہاں کی حیات ہے گو یہاں کی موت پر طبعاً حزن بھی ہوتا ہے اور کاملین کو بھی ہوتا ہے تو وہ مقتضا طبع کا ہے جیسا فرح مقتضا (۴) عقل کا ہے اور گو وہ حضرات اپنی قوت عقلی سے اس مقتضیات طبع کو روک بھی سکتے ہیں مگر اس حزن وبکاء میں وہ حکمتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اس لیے وہ امر طبعی کو روکتے نہیں۔ چنانچہ اس حکمت کا بیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادہ کے واقعہ وفات میں ارشاد

(۱) شوروہنگامہ برپا ہوجائے (۲) جانے والا لوٹ کر واپس اس دنیا میں ہمارے پاس نہیں آئے گا (۳) خوش (۴) جیسے عقل کا تقاضہ خوش ہونا ہے۔

بھی فرمادیا۔ انماھذہ رحمۃ الخ (۱) پس اس کلیہ کی بنا پر خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر وفات میں بھی جہاں طبعاً حزن ہے وہاں عقلاً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرح سے فرح بھی ہونا چاہئے۔

رحمۃ للعالمین

میں وفات سے فرح کرنے کو نہ کہوں گا بلکہ بیچ میں ایک واسطہ بڑھاتا ہوں کہ حضور کی فرح سے عقلاً فرح بھی ہونا چاہئے اور حضور کے لیے اس واقعہ کا موجب فرح ہونا حدیثوں سے معلوم، قرآن سے معلوم، اس میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ احادیث تو بعض گزر چکی ہیں۔ قرآن میں ہے۔ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ اور آخرت آپ کے لیے دنیا سے بہتر ہے۔

چنانچہ نشر الطیب میں ہے کہ طبرانی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ جب سورۃ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ نازل کی گئی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ مجھ کو میری موت کی خبر (اشارہ) سنائی گئی ہے تو جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ تو آیت کا شامل ہونا اس واقعہ کو صریح معلوم ہوا اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جس کو خیر فرمادے وہ آپ کو محبوب کیوں نہ ہوگا اور جب محبوب ہے تو پھر اس پر حضور کو فرح (۲) کیوں نہ ہوگا تو ہم کو بھی عقلاً اس پر فرح ہونا چاہئے کہ حضور کو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے وہ برکات و درجات آخرت میں عطا فرمائے جن کو آپ چاہتے تھے اولاً و بالذات آپ کو اور ثانیاً و بالعرض آپ کی امت کو اور یہاں سے حضور کی شان رحمۃ للعالمین ہونے کی ظاہر ہوتی ہے کہ واقعی آپ مجسم رحمت ہیں اور آپ کی ہر بات میں رحمت ہے اور ایسی رحمت ہے کہ آپ کا یہ واقعہ فاجعہ ہائلہ (۳) بھی موجب رحمت و برکت ہوگیا اور جب امت کے لیے واسطہ رحمت ہوگیا۔ تو آپ کے لیے کیسا کچھ ہوگا جس کا بیان عنقریب آتا ہے مگر اس سے پہلے یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہے اس کو حل کرتا چلوں۔

اشکال کا جواب

وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رحمۃ للعالمین ہیں تو ابوجہل پر بھی کچھ رحمت ہونا

(۱) بیشک یہ اللہ کی رحمت ہے (۲) خوشی کیوں نہ ہوگی (۳) آپ کا یہ دل ہلا دینے والا واقعہ بھی باعث رحمت و برکت ہوگیا۔

چاہئے۔ کیونکہ عالمین میں تو وہ بھی داخل ہے اور کوئی قید یہاں ہے نہیں، تو ابوجہل پر کیا رحمت ہوگی؟ کیا آخرت میں بخشا جائے گا یہ تو نصوص کے خلاف ہے یا کچھ عذاب کم ہوگا تو اس کی کوئی دلیل نہیں۔ ابوطالب کے لیے تو حدیث میں تخفیف عذاب کی خبر ہے گو یہ نہ ہوا کہ جیل خانہ سے بالکل نکال دیئے گئے ہوں حالانکہ حضور کے رشتہ دار تھے۔ جان نثار مددگار بھی تھے مگر ایمان نہ تھا۔ بس اتنی رعایت کردی گئی اور واقعی بڑی رعایت ہے کہ سب سے کم عذاب ابوطالب کو ہے۔ مگر وہاں رشتہ داریوں اور خدمت گزاریوں سے کام نہیں چلتا وہاں تو ایمان سے کام چلتا ہے۔ اس سے حق تعالیٰ نے گو یہ بتلادیا کہ حضور ﷺ خدا کے بندے ہیں رشتہ دار نہیں۔ اگر رشتہ دار ہوتے تو آپ کا رشتہ دار خدا تعالیٰ کا بھی رشتہ دار ہوتا۔ خدا تعالیٰ اپنے رشتہ دار کو تھوڑا ہی عذاب کرتے ضرور نجات دے دیتے۔ کیا حق تعالیٰ کو نعوذ باللہ یہ قدرت نہیں ہے کہ بالکل نجات دے دیتے مگر یہ دکھلا دیا کہ ہم ایسے قادر ہیں کہ اتنے بڑے معزز ومقرب رسول کے چچا کی بھی پروانہیں کرتے۔

سلاطین دنیا ایسے موقع پر ضرور دب جاتے ہیں جب کہ وزیر اعظم کا کوئی عزیز جرم کا ارتکاب کرے تو اس کو بے تکلف سزا نہیں دے سکتے کیونکہ وزیر اعظم کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے جس سے سلطنت پر خطرہ ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ کو نہ کسی کا خطرہ نہ ان کے مقرب ایسے جو مرضی حق کے خلاف کا قصد کریں۔ تو اس سے یہ بتلادیا کہ محمد ﷺ ہمارے بندے اور رسول ہیں رشتہ دار نہیں ورنہ ان کا چچا ہمارا بھی چچا یا بھتیجا کچھ تو ہوتا۔ پھر اس کو عذاب کرنا سہل نہ ہوتا۔ وہ ضرور مقابلہ کرتا بس رسول اللہ ﷺ کو خدا یا خدا کا رشتہ دار نہ بناؤ بلکہ بندہ ہی سمجھو۔ مگر ایسے بندہ ہیں جیسے ایک بزرگ کا مقولہ ہے۔

بشر لا کالبشر بل کالیاقوت بین الحجر یعنی ہیں تو بشر مگر ایسے بشر ہیں، جیسے پتھروں میں یاقوت کہ وہ بھی پتھر ہی ہوتا ہے مگر سب سے ممتاز۔ جن لوگوں نے حضور کو الوہیت تک پہنچایا ہے۔ اس واقعہ سے ان کی آنکھیں کھلنی چاہئیں۔ غرض سوال یہ ہے کہ ابوجہل پر آپ کی رحمت کا کیا اثر ہوا۔

اس کا ایک جواب تو تکلف کا یہی ہے کہ ممکن ہے کہ جتنی سزا جہنم میں اس کو استحقاقاً ملتی حضور کی برکت سے اس میں کچھ کمی ہوگئی ہو مگر یہ تکلف کا جواب ہے۔ طالب

حقیقت کو اس سے تسلی نہیں ہوسکتی گو مناظرہ میں خصم کو بند کرنے کے لیے کافی ہے کیونکہ قواعد علمیہ میں معترض کے مقابلہ میں احتمالات نکال دینا کافی ہے جس کا حاصل منع ہے۔

رحمۃ للعالمین ہونے کا مطلب

الحمدللہ! کئی مہینے ہوئے اس اشکال کا ایک اور جواب میرے دل میں آیا ہے۔ وہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہادم بناء اشکال ہے(۱)۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ یہاں رحمت سے مراد رحمت تبلیغ وارسال ہے نجات وآخرت کے اعتبار سے رحمت مراد نہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ الا رحمۃ اس جگہ ارسال کی غایت ہے۔ یہ اس کا قرینہ ہے کہ یہاں رحمت سے وہی مراد ہے جو ارسال(۲) پر مرتب ہوتی ہے۔ نیز اس سے پہلے ارشاد ہے۔ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ بے شک اس میں کافی مضمون ان لوگوں کے لیے ہے جو بندگی کرنے والے ہیں۔

یہ بھی اس کا قرینہ ہے کہ یہاں تبلیغ کی برکات کا ذکر ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ ہم نے جو آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے تو اس سے اہل علم پر مہربانی کرنا منظور ہے کہ آپ کے ذریعہ سے لوگوں کی طرف وحی پہنچائیں اور ان کو فلاح کے طریقے بتلائیں تاکہ ان کو ہدایت کے راستے معلوم ہوں۔ خدا تک پہنچنے اور اُس کو راضی کرنے کا طریقہ واضح ہوجائے۔ یہاں یہ خاص مہربانی ورحمت مراد ہے اور ظاہر ہے کہ یہ رحمت تمام عالم کو عام ہے کوئی فرد بشر اس سے محروم نہیں رہا چاہے کوئی ہدایت قبول کرے یا نہ کرے، یہ اس کا فعل ہے مگر حق تعالیٰ کی طرف سے تو رحمت میں کمی نہیں ہوئی۔

شاگرد پر استاد کی عنایت یہی ہوتی ہے کہ وہ اس کو سبق پڑھاوے اور شفقت سے سمجھادے۔ اب شاگرد توجہ نہ کرے اور سسرا سمجھانے سے بھی سمجھنے کا قصد نہ کرے تو استاد کی شفقت میں اس سے کیا کمی ہوسکتی ہے کچھ بھی نہیں۔ پس یہاں یہ رحمت مراد ہے کہ ہم نے مکلفین کے حال پر رحم کرکے قرب ونجات کے طریقے کھول دیئے ورنہ ان کو خود اپنی عقل سے خدا تعالیٰ کے راضی کرنے کا طریقہ دریافت کرنا پڑتا اور اس میں جو

(۱) اشکال کی بنیاد کو منہدم کرنے والا ہے (۲) جو آپ کی رسالت پر مبنی ہے۔

مصیبت تھی ظاہر ہے اور مصیبت جھیلنے کے بعد بھی اطمینان نہ ہوتا کہ خدا تعالیٰ اس فعل سے واقعی میں راضی ہیں یا نہیں اور اب کوئی خلجان نہیں وحی نے سب باتیں صاف صاف بیان کر دیں۔ اب ذرا مہربانی کر کے اس جواب پر تو کچھ اشکال کیجئے بحمد اللہ تعالیٰ اس پر کوئی اشکال وارد نہ ہوگا اور ثابت ہو گیا کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے رحمت ہیں۔ یہ جواب ہے جس سے سارے اشکالات کی جڑیں اکھڑ گئیں اور جواب کا لطف یہی ہے کہ سلیس بھی ہو اور نفیس ہو۔ سو اس جواب میں دونوں باتیں موجود ہیں۔ یہ تو آپ کی شان رحمت عامہ کے متعلق کلام تھا۔

فتح مکہ کے فوائد

باقی اگر رحمت خاصہ کے اعتبار سے دیکھا جاوے تو اس کو مدلول اس آیت کا نہ کہیں گے۔ اس لیے کوئی اشکال ہی متوجہ نہ ہوگا اور آپ کی ہر حالت اور ہر واقعہ کا موجب رحمت ہونا حتی کہ واقعہ سفر آخرت کا بھی۔ خود آپ کے لیے بھی اور آپ کی امت کے لیے بھی بلاغبار ثابت رہے گا۔ اب وقت آ گیا کہ حسب وعدہ قریبہ ان برکات کا بیان کیا جاوے جن کا ظہور اس واقعہ سے ہوا آپ کے لیے اولاً وبالذات اور امت کے لیے ثانیاً وبالعرض۔ اور اس جلسہ سے یہی بیان مقصود ہے اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس واقعہ کے برکات ان برکات سے بہت زیادہ ہیں جن کا ظہور ولادت شریفہ سے ہوا ہے کیونکہ ولادت شریفہ ان برکات کا افتتاح ہے اور یہ واقعہ اُن کا مُکمِل اور ابتداء اور انتہاء میں فرق ظاہر ہے پھر ذکر کے لیے اس کو خاص کرنا اور اُس کو چھوڑنا کوئی معنی نہیں۔ اور برکات کے ساتھ لفظ ظہور اس لیے کہا گیا کہ حصول تو پہلے سے تھا صرف ظہور خاص وقت میں ہو گیا۔ جیسے کسی کو تحصیلدار بنا دیا جاوے تو عہدہ تو حاصل اسی وقت ہو گیا مگر ظہور اس وقت ہوگا جب کسی تحصیل کا کام سپرد کر دیا جاوے گا۔ اب سب سے اول اُن برکات کو بیان کرتا ہوں جو اس سورت میں صراحۃً یا اشارۃً مذکور ہیں۔ اس کے بعد بقیہ برکات کا احادیث سے بیان کیا جاوے گا۔

ترجمہ وتفسیر سورۃ

اس لیے میں اس سورت کا ترجمہ کرتا ہوں جس میں ان نعمتوں کا ذکر ہے جو

سفر آخرت کے متعلق آپ پر کی گئی ہیں۔ حاصل ترجمہ یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی نصرت سے فتح مکہ ہوجائے اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں جوق جوق داخل ہورہے ہیں اس وقت تسبیح میں حمد کے ساتھ مشغول ہوجائے اور استغفار کیجئے اور یوں سمجھئے کہ ارسال کی جو غرض تھی وہ پوری ہوچکی اب دنیا میں رہنا ختم ہوا۔ آخرت کی تیاری کیجئے اور اللہ اللہ کیجئے کیونکہ تبلیغ کا کام ختم ہوا۔ اب خدا کے پاس جانے کی تیاری کیجئے۔ یہ تو ترجمہ کا حاصل ہے اور یہ اس وقت ہے جب کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے مانا جاوے کیونکہ اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا ہے اور اس کے نازل ہونے کے بعد حضور دو برس اور زندہ رہے نزول کے وقت نہ مکہ فتح ہوا تھا نہ يَدۡخُلُونَ فِي دِينِ ٱللَّهِ أَفۡوَاجًا اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہوں گے کا ظہور ہوا تھا۔ اس صورت میں ان آیات میں پیشین گوئی ہے کہ ایسا ہونے والا ہے۔ اس وقت سمجھ لیجئے گا کہ تبلیغ کا مقصود ختم ہوگیا اور فتح مکہ پر اس مقصود کی تکمیل اس لیے موقوف تھی کہ عام لوگ اسلام لانے میں اہل مکہ کے اسلام کے منتظر تھے کہ دیکھئے نبی کی قوم بھی ان کی اطاعت کرتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ عوام کی یہ طبعی بات ہے عقلاء کی تو نہیں کہ وہ کسی شخص کے معتقد بننے میں یہ دیکھا کرتے ہیں کہ اس شخص کے خاندان اور بستی والے کچا چٹھا جانتے ہیں۔ وہ ایسے ویسے شخص کے معتقد نہیں ہوا کرتے یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ سچے آدمی کے بھی معتقد نہ ہوں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ جھوٹے آدمی کے معتقد ہوجائیں۔ خصوصاً خاندان والے تو بہت دیر میں معتقد ہوتے ہیں کیونکہ ان میں کوئی تو اس شخص کا چچا ہے کوئی ماموں ہے کوئی بھائی بھتیجا ہے جن کو مساوات کا یا ناز کا دعویٰ ہوتا ہے یا بزرگی کا وہ اپنے سے چھوٹے یا برابر کی اطاعت جبھی کرسکتے ہیں جبکہ کھلم کھلا کوئی ایسی بات دیکھ لیں جو ان کو اطاعت پر مجبور کردے۔ مگر اس پر عوام ہی کی نظر ہوتی ہے کہ خاندان والوں کا کیا خیال ہے۔

عقلاء صحابہ کا ایمان لانا

باقی عقلاء کو کسی کے اعتقاد اور عدم اعتقاد پر نظر نہیں ہوتی بلکہ وہ تو کمالات کو

دیکھتے ہیں۔ اگر ایک شخص میں کمالات موجود ہوں چاہے خاندان اور بستی ہی کیا ساری دنیا بھی اس کی مخالفت کرتی ہو۔ تب بھی معتقد ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ عقلاء صحابہؓ نے ایسا ہی کیا کہ انہوں نے اہل مکہ یا حضور کے قرابت داروں کی اطاعت کا مطلق انتظار نہیں کیا بعض تو ایسے وقت اسلام لائے تھے کہ حضور کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا اور بعض نے ایسے وقت اطاعت اختیار کی کہ آپ کے ساتھ دو چار ہی آدمی تھے البتہ عام لوگ اس کو دیکھتے ہیں کہ خاص بستی والے اور خاندان والے کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ کیونکہ عوام کی نظر کمالات تک نہیں پہنچتی۔ اس لیے وہ ایسے ایسے قرائن کا انتظار کیا کرتے ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق عام طور پر اہل عرب کو اہل مکہ کے اسلام کا انتظار تھا کیونکہ وہاں آپ کی برادری تھی اور اسی لیے کم لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور رسول اللہ ﷺ مکہ میں غالب ہوکر داخل ہوئے تو اس وقت بہت سے اہل مکہ مسلمان ہوگئے اور بعض نے غور وتامل کے لیے مہلت مانگی تو ان کو چار مہینے یا اس سے زائد کی مہلت دی گئی کہ اس مدت میں یا اسلام لے آئیں یا مکہ سے نکل جائیں اس وقت مکہ دارالاسلام ہوگیا اور چند روز میں وہاں ایک بھی کافر نہ رہا اس وقت عام طور پر اہل عرب جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ پہلے تو ایک دو ہی آدمی روزانہ اسلام لاتے تھے اور فتح مکہ کے بعد دیہات کے دیہات اور ایک ایک دن میں ایک ایک ہزار دو دو ہزار اسلام لانے لگے اور جب یہ خبر اچھی طرح پھیل گئی کہ مکہ والے مسلمان ہوگئے ہیں تو پھر قبائل عرب ایک دم سے امڈ پڑے اور جو لوگ بعد مسافت (۱) کی وجہ سے سب کے سب نہ آسکتے تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے وفود بھیجے کہ حضور کو جاکر ہمارے اسلام کی اطلاع کردو اور وہاں سے احکام دریافت کرکے آؤ۔ چنانچہ اسی لیے ۹ کو سنۃ الوفود کہتے ہیں اور اسی لیے آپ ۹ھ میں حج کو تشریف نہیں لے جاسکے حالانکہ فتح مکہ کے بعد حج فرض ہوگیا تھا۔ کیونکہ اس سال آپ وفود کی تبلیغ وتکمیل میں مشغول تھے۔ پھر ۱۰ھ میں آپ نے حج ادا کیا جس میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ کے بعد ہوا اور ایک روایت یہ

(۱) دور دراز ہونے کی وجہ سے۔

ہے کہ حجۃ الوداع میں اس کا نزول ہوا ہے۔ ان سب روایتوں میں جمع اس طرح ہوسکتا ہے کہ نزول تو فتح مکہ سے پہلے ہوا ہو مگر حضور نے فتح مکہ کے بعد یا حج وداع میں کثرت تسبیح وتحمید کی وجہ بیان فرماتے ہوئے اس سورت کو تلاوت فرمایا ہو۔ راوی نے یہ سمجھا کہ ابھی نزول ہوا ہے مگر جن راویوں نے اس کا نزول فتح مکہ کے بعد متصل یا حج وداع میں مانا ہے۔ ان پر یہ اشکال وارد ہوگا کہ اس میں لفظ اذا ہے جو مستقبل کے لیے آتا ہے۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ نزول کے وقت فتح مکہ ودخول الناس افواجا کا وقوع نہ ہوا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ إِذَا کبھی ماضی کے واسطے بھی آتا ہے جیسے قرآن میں دوسری جگہ ہے حَتَّىٰٓ إِذَا جَعَلَهُۥ نَارًا اور حَتَّىٰٓ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ ٱلصَّدَفَيْنِ ۔ تو پہلی تقدیر پر تو ترجمہ یہ تھا کہ جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح مکہ ہوجائے اور آپ لوگوں کو جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو تسبیح وتحمید میں مشغول ہوجائیں اور دوسری تقدیر پر ترجمہ یوں ہوگا کہ جب اللہ کی مدد آچکی ہو اور فتح مکہ ہوچکا ہو اور لوگوں کو اسلام میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا آپ نے دیکھ لیا ہو تو اب آخرت کی تیاری کیجئے۔ بالکل شروع وعظ میں بھی اس کا کچھ ذکر ہوا ہے یہ تو ترجمہ اور توجیہ تھی اقوال مفسرین کی اب میں وہ نعمتیں بتلاتا ہوں جو حضور کو یا تبعاً امت کو سفر آخرت کی وجہ سے عطا ہوئیں اور اس سورت میں ان پر دلالت ہے۔

بشارت تکمیل دین

سو اس پر تو سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سورت کا نزول سفر آخرت کی تیاری کے لیے ہوا ہے اور اس کو متعلق کیا گیا ہے چند علامات پر جو اس جگہ مذکور ہیں یعنی نصر وفتح مکہ ورویت دخول الناس فی الدین تو ایک نعمت تو یہ ہوئی کہ آپ کا سفر آخرت سبب ہوگیا شیوع اسلام کا۔ گو ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیوع اسلام آپ کے سفر آخرت کا سبب ہوا کیونکہ سلاطین کی عادت بھی یہی ہے کہ کسی افسر کو کسی کام کی تکمیل کے لیے بھیجتے ہیں۔ کام پورا ہونے کے بعد اس کو اپنے پاس بلا لیتے ہیں اور دلالت لفظ سے بھی یہی متبادر ہے۔ چنانچہ یہاں لفظ اذا یہی بتلا رہا ہے کیونکہ اذا تعلیق کے لیے ہے تو مجئی نصر وفتح مکہ وغیرہ معلق علیہ ہے اور تیاری آخرت معلق اور ظاہراً معلق علیہ سبب ہوا

کرتا ہے معلق کا۔ لیکن اگر نظر کو گہرا کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ واقع میں یہاں معلق سبب ہے معلق علیہ کا آگے اس کی دلیل آتی ہے سو اس بناء پر یہاں معلق علیہ محض علامات کے درجہ میں ہوگا۔ اس کو معلق کے ساتھ سببیت یا علیت کا تعلق نہیں ہوگا۔

بس اس کی مثال بالکل ایسی ہے (جیسے ہم کسی کو کہیں بھیج کر اس سے کہہ دیں کہ جس وقت ہم جھنڈی ہلا دیں اس وقت واپس چلے آنا تو ظاہر میں تو جھنڈی کے ہلنے کو دخل ہے اس شخص کی واپسی میں مگر حقیقت میں اس کی واپسی کو جو کہ اصل مقصود ہے دخل ہے جھنڈی کے ہلنے میں اور اس کی دوسری مثال یہ ہے ۱۲) جیسے کوئی بادشاہ ایک انجینئر کو جو کہ اس کا محبوب ومقرب ہے کسی جگہ بھیجے کہ وہاں جا کر ایک نہر کھدواؤ جس سے تمام ملک کو سیرابی حاصل ہو۔ وہ گیا اور وہاں جا کر اس نے اپنے عملہ کے ساتھ کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ چند روز کے بعد بادشاہ کو اس کا اپنے پاس جلدی بلانا مقصود ہوا۔ اس لیے ایک بہت بڑا عملہ اس کام کی تکمیل میں اس کی امداد کے لیے اس کی ماتحتی میں بھیج دیا جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں نہر کو کھود کر اور انجینئر کے حکم اور نقشہ کے مطابق بنا سنوار کر درست کر دیا اور اس نے بادشاہ کو اطلاع کر دی کہ حضور کا کام پورا ہو گیا وہاں سے حکم ہوا کہ اچھا اب تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ تو ظاہر میں تو تکمیل نہر کی اس کے بلانے کا سبب ہوا مگر حقیقت میں بادشاہ کا اس کو بلانا تکمیل نہر کا سبب ہوا اگر وہ اس کو جلدی بلانا نہ چاہتا تو دوسرا عملہ کیوں بھیجتا۔ اب اس کی تحقیق باقی ہے کہ جب تعلیق میں دونوں صورتیں ہوتی ہیں تو یہاں دونوں احتمال ہوئے ایک کی تعیین کی کیا دلیل؟۔

جواب ہے کہ قرائن سے تعیین ہو جاتی ہے یہاں آپ کی محبوبیت قرینہ مرجحہ ہے(۱) اس احتمال کا۔ چنانچہ اوپر بیہقی کی حدیث میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقولہ یا محمد ان اللہ قد اشتاق الی لقائك اس پر صریح دال ہے کہ بلانے کا سبب اشتیاق ہے۔ تو بلانا جن اسباب پر موقوف تھا ان کی تکمیل بھی اس اشتیاق کے سبب فرمائی۔ تو سبب ہوا بلانا اور تکمیل دین مسبب ہوا۔ پس اس پر تعلیق علامت پر تعلیق ہوئی نہ کہ سبب پر۔ یعنی حق تعالیٰ نے حضور کو بلانا چاہا اور کام پورا ہوا نہ تھا اس لیے حق تعالیٰ نے اس کا

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کا محبوب ہونا اس ترجیح کا قرینہ ہے۔

یہ سامان فرمایا کہ ایک دم سے ملائکہ کو حکم دیا کہ مجاہد مسلمانوں پر سکینہ نازل کرو اور کفار کے دل میں رعب ڈال دو۔ اس سے تو مکہ فتح ہوگیا پھر ملائکہ کے دوسرے عملہ کو حکم دیا کہ لوگوں کے قلب میں اسلام کی طرف میلان پیدا کرو۔ اس سے جوق جوق لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں حضور کے سامنے ہی جزیرہ عرب سب مسلمان ہوگیا اور صحابہ کو جابجا اشاعت اسلام وفصل حکومت وقضا کے لیے بھیج دیا۔ اب آپ کو بھی اطمینان ہوگیا کہ آئندہ کے لیے یہ لوگ اشاعت اسلام کا کام کرنے کے لیے کافی ہیں اور اتنے آدمی مسلمان ہوگئے ہیں جو تمام عالم میں اسلام کو پھیلا سکتے ہیں اس وقت حضور کو اطمینان کی حالت میں بلالیا گیا۔ اس برکت کا اثر حضور پر بھی ہے یعنی تکمیل اجر وتبلیغ اور امت پر بھی ہے یعنی تکمیل عقائد واعمال اور یہ نعمت تکمیل دین کی اس سے زیادہ صریح الفاظ میں اس آیت میں مذکور ہے۔ ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا (۲) اور یہ آیت بھی آپ کی اخیر عمر ہی میں نازل ہوئی۔ پس یہ سورت اور یہ آیت بشارت تکمیل دین میں گویا مترادف ہیں۔

ارتفاع حجاب

دوسری برکت حضور کی سفر آخرت کی یہاں اور بھی مذکور ہے گو صراحۃً نہیں لیکن اشارۃ ہے وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے: انہ لیغان علی قلبی وانی لا ستغفر اللّٰہ فی الیوم سبعین مرۃ (۱) یعنی حضور فرماتے ہیں کہ کبھی میرے دل پر بھی غین طاری ہوجاتا ہے جس کے معنی لغتاً غبار کے ہیں۔ لغوی ترجمہ یہ ہوا کہ کبھی میرے دل پر بھی غبار آجاتا ہے اور میں اس کے تدارک کے لیے دن میں ستر دفعہ (یا سو دفعہ) استغفار کرتا ہوں۔

اس حدیث کی شرح میں علما چکرا گئے ہیں کیونکہ یہ کس کی مجال ہے جو حضور کے دل پر غبار آنا مان لے۔ آپ کا دل تو آئینہ مصفا ہے اگر آپ کے دل پر غبار آسکتا

(۲) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کردیا اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا'' سورۃ المائدہ: ۳ (۱) وفی روایت ماۃ مرۃ ۱۲۔ الصحیح لمسلم کتاب الذکر: ۴۱، سنن أبی داد: ۱۵۱۵، مسند الامام احمد: ۴/ ۲۱۱، ۲۶۰، مشکوۃ المصابیح: ۲۳۲۴، الدر المنثور: ۶/ ۶۳، کنز العمال: ۲۰۷)۔

ہے تو پھر ہمارا تو کہاں ٹھکانہ رہے گا۔ پھر یہ کس کی مجال ہے جو اس حدیث کی حقیقت بیان کر سکے کہ حضور کی مراد غین سے کیا ہے۔ آخر کار بعض نے تو تنگ آ کر یہ کہہ دیا کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے۔ اس کی تفسیر کرنا اور اس میں غور کرنا نہیں چاہئے اور واقعی بہت اچھا کہا۔ ادب کی بات یہی ہے کہ جس بات کی حقیقت معلوم نہ ہو وہاں ذہن کے گھوڑے نہ دوڑایئے اور جس مقام پر آدمی پہنچے نہیں وہاں عقلی خیالات دوڑانا محض فضول ہے۔ ایک عارف سے کسی نے پوچھا تھا کہ معراج میں حضور کے ساتھ حق تعالیٰ نے کیا باتیں کیں۔ انہوں نے جواب دیا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد(۱)

اسی طرح ایک مجذوب سے کسی نے ایک واقعہ کی نسبت دریافت کیا کہ اس کا کیا انجام ہوگا۔ تو وہ بہت خفا ہوئے۔ کہا مجھے کیا خبر انجام کیا ہوگا۔ کیا میں اللہ میاں کا سرشتہ دار ہوں یا ممبر کمیٹی ہوں کہ مجھ سے پوچھ پوچھ کر وہ کام کرتے ہیں۔ واقعی آج کل تو لوگ مجذوبوں کو اللہ میاں کا سرشتہ دار ہی سمجھتے ہیں کہ ان کو سب خبر ہے۔ سو یہ تو غلط ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ یہ لوگ بلبک (۲) بہت لگاتے ہیں کوئی بات انہیں معلوم ہوجاتی ہے تو پیٹ کے ہلکے ایسے ہوتے ہیں کہ فوراً بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں۔ اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں:

راز درون پردہ زرندان مست پرس کیں حال نیست صوفی عالی مقام را(۳)

یہ مطلب نہیں کہ محقق کو کچھ معلوم نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ محقق صاحب مقام ہوتا ہے صاحب حال نہیں ہوتا جس سے مغلوب ہوجاوے اس لیے وہ کبھی ان امور کو ظاہر نہ کرے گا پتہ بھی نہ دے گا بہر حال بہت سوں نے اس حدیث کو متشابہ کہہ دیا۔ مگر صوفیہ چونکہ بہ نسبت اوروں کے حقیقت شناس ہوتے ہیں اور ذوق سے مطمئن بھی ہوجاتے ہیں اس لیے انہوں نے اس کو متشابہ نہیں کہا بلکہ مطلب بیان کیا ہے چونکہ قواعد شرعیہ کے خلاف نہیں اس لیے نہایت لطیف مضمون ہے اور اگر کسی کو اس سے قناعت ہوجائے تو علم عظیم ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ غین وہ نہیں جو عام قلوب پر گناہوں کی وجہ سے ہوجاتا ہے۔

(۱) ''اب کس کا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا''
(۲) تخمینے (۳) ''پردہ کے اندر کا راز رندوں سے مت پوچھو یہ اونچا مرتبہ صوفیوں پر روشن نہیں ہے''۔

توجہ الی اللہ

اس سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منزہ وارفع واعلیٰ ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصلی مذاق توجہ الی اللہ بلا واسطہ ہے اور یہ مذاق حضور کا طبعی ہے حتی کہ قبل وحی اس کا ظہور غار حرا کی خلوت سے ہوتا تھا۔ غرض مذاق تو یہ تھا اور آپ کے سپرد ہوا کام تبلیغ کا جس میں توجہ الی اللہ بواسطہ تھی اہل ظاہر تو اس کو توجہ الی الخلق کہیں گے مگر محقق کبھی ایسا نہ کہے گا بلکہ وہ اس کو بھی توجہ الی الحق کہتا ہے مگر بواسطہ خلق۔ جیسے کوئی شخص آنکھوں پر عینک لگائے ہوئے ہو تو ایک ناواقف تو جس کو عینک کی خاصیت معلوم نہیں کہ نگاہ اس میں سے نفوذ کر جاتی ہے یہ سمجھے گا کہ یہ شخص عینک کو دیکھ رہا ہے۔ مگر واقف کہے گا کہ یہ ناظر اشیاء بواسطہ عینک ہے۔

اسی طرح کوئی شخص آئینہ میں کسی محبوب کی صورت دیکھ رہا ہے تو ناواقف یوں کہے گا کہ آئینہ کو دیکھ رہا ہے اور محقق جس کو معلوم ہے کہ آئینہ میں محبوب کی صورت کا عکس پڑ رہا ہے یہ کہے گا کہ ناظر محبوب بواسطہ آئینہ ہے۔ اور عارفین کی خصوصاً انبیاء علیہم السلام کی حالت یہ ہے کہ ما رایت شیئا الا رایت اللہ فیہ بل رایت اللہ قبلہ(۱) یہاں ایک آیت کی ایک جدید توجیہ سمجھ میں آجائے گی جو گو کہ تفسیر تو نہیں ہے مگر لطیفہ تصوفیہ خوب ہے۔ وہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے ساتھ اثبات توحید کے لیے جو گفتگو کی اس میں کواکب وقمر وشمس وغیرہ کو ھذا ربی فرمانا بھی ان آیات میں مذکور ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ ٱلَّيْلُ رَءَا كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ ٱلْـَٰٔفِلِينَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَءَا ٱلْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِى رَبِّى لَأَكُونَنَّ مِنَ ٱلْقَوْمِ ٱلضَّآلِّينَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَءَا ٱلشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَٰذَا رَبِّى هَٰذَآ أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّآ أَفَلَتْ قَالَ يَٰقَوْمِ إِنِّى بَرِىٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ (۲)

(۱) ”کہ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں اس کے اندر بلکہ اس سے پہلے خدا کو دیکھتے ہیں“ (۲) پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا آپ نے فرمایا کہ یہ میرا رب ہے (ف ۳) سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والے لوگوں سے محبت نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے سو جب وہ غرب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرتا رہے تو بیشک میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا (ف ٤) تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے یہ تو سب سے بڑا ہے۔ سو جب وہ غروب ہو گیا آپ نے فرمایا اے قوم بیشک میں تمھارے شرک سے بیزار ہوں۔ (ف ٥) سورہ انعام: ۷۶ تا ۷۸

مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ یہ ارخاء عنان بطور الزام ہے کہ ستاروں کو دیکھ کر فرمایا، ہاں بھائی ہاں، لو یہ خدا ہے۔ پھر جب وہ غروب ہوگئے تو ان کے نقائص کو ظاہر کر کے توحید کو ثابت کیا کہ خدا بھی کوئی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی عالی کبھی سافل (۱) مگر ہمارے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کو کوکب میں اول ظاہر پر نظر پڑی۔ اس کی نسبت فرمایا۔ ھذا ربی (یہ میرا رب ہے) پھر مظہر کی طرف التفات ہوا اس کی نسبت فرمایا لا احب الافلین۔ مطلب یہ تھا کہ اس کوکب کے اندر جو مجھے نظر آرہا ہے وہ میرا خدا ہے اور تم جو کوکب کی پرستش کرتے ہو میں اس سے بیزار ہوں۔

غرض عارفین مخلوق کو مرآۃ (۲) سمجھتے ہیں سو دوسرے لوگ تو اول مراہ کو دیکھتے ہیں اور عارفین اول مراہ کے اندر محبوب کو دیکھتے ہیں تبعاً مراہ پر بھی نظر پڑ جاتی ہے اس لیے حضور کے لیے تبلیغ کی توجہ الی الخلق نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ توجہ الی الحق ہی ہے مگر بواسطہ خلق ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دیدار بلا واسطہ اور بواسطہ کا فرق

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ آپ کا طبعی تقاضا یہ تھا کہ بلا واسطہ محبوب کو دیکھوں چونکہ طبعی مذاق یہ تھا۔ اس لیے تبلیغ میں توجہ بواسطہ سے طبعاً تنگی اور کدورت ہوتی تھی۔ اسی نفی واسطہ کی مطلوبیت کو کہتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم (۳)

جس کو اپنا حجاب بھی گران ہو اس کو دوسری مخلوق کا واسطہ کیوں گراں نہ ہوگا۔ اس کو آپ نے غین سے تعبیر فرمایا۔ اور گو عقلاً آپ اس میں بھی ہر طرح راضی اور خوش تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ محبوب کو بے حجاب دیکھنے میں اور مرآۃ میں دیکھنے میں طبعاً تو فرق ہوتا ہے اور امور طبعیہ اختیار سے باہر ہیں۔ اس لیے یہ تنگی خلاف رضا نہیں مگر طبعاً پھر بھی اس سے استغفار فرماتے تھے باقی یہ کہ استغفار کیوں فرماتے تھے تاکہ اس سے توجہ بلا واسطہ سے توجہ بواسطہ کا تدارک

(۱) جس پر نظر پڑے اس کو آئینہ سمجھتے ہیں عارفین اس نظر آنے والی چیز میں محبوب کا نظارہ کرتے ہیں (۲) کبھی بلند کبھی پست (۳) ''مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ محبوب کے رخ انور کو نہ دیکھنے دوں اور نہ کانوں کو اس کی باتیں سننے دوں''۔

ہوجاوے اور گو یہ تدارک ہر ذکر سے ہوسکتا تھا مگر یہ آپ کا ادب تھا کہ آپ نے سمجھا کہ رفع غین قلب کے لیے حق تعالیٰ نے استغفار ہی کو مشروع فرمایا ہے اور یہ بھی غین ہے گو دوسری نوع ہے تو اس کے لیے بھی تمام اذکار میں سے استغفار ہی مناسب ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھئے کہ اس سورت فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (۱) کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی رؤیت بلا حجاب میں مشغول رہنے کی اجازت ہے اور مشغولی بھی فراغ کے ساتھ۔ چونکہ تبلیغ سے فراغ ہوگیا ہائے! حضور تو اس کو سن کر جی اٹھے ہوں گے کہ الحمد للہ اب راحت کا وقت آیا ساری عمر تو تبلیغ میں حجاب کے ساتھ رویت تھی اب تبلیغ کا کام ختم ہوگیا اب بلا حجاب رویت میں مشغول ہوں گے۔

بے حجابانہ در آ ازدر کا شانہ ما کہ کسے نیست بجز درد تو در خانہ ما(۲)

اور

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم(۳)

یہ بھی غیر ہے۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم(۴)

بس اب محبوب ہوں گے اور ہم ہوں گے۔

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے کہ پارے بر خورد از وصل یارے

اور

چہ خوش ست با تو بزمے بنہفتہ ساز کردن در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن(۵)

آپ کے تو بال بال میں اس کو سن کر جان آ گئی کہ اب رویت بلا حجاب کی اجازت ہوگئی جیسے ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

---

(۱) ''تو اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجئے اور اس سے مغفرت کی درخواست کیجئے'' سورۃ النصر: ۳ (۲) ''بے دھڑک اندر آجا میرے اس کاشانہ (دل) میں تیرے سوا اور کوئی موجود نہیں'' (۳) ''یہ آنکھ بیچ میں کہاں سے آ گئی، بھلا آنکھ اور تجھے دیکھے'' (۴) ''مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ انکو محبوب کے رُخ انور کو نہ دیکھنے دوں اور نہ کانوں کو اس کی باتیں سننے دوں'' (۵) ''کیسا لذیذ ہے تیرے ساتھ تنہائی میں ساتھ رہنا، تمام تعلقات سے یکسو ہوجانا اور ترقی میں سرشار رہنا''۔

وقت آن آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم(۱)

عریاں سے مراد بے حجاب ہوجانا ہے مگر وہی حجابات جو ہماری استعداد کے اعتبار سے مرتفع ہوسکتے ہیں نہ کہ کل حجابات، یہ مرتبہ تو جنت میں بھی میسر نہ ہوگا۔ وہاں سب سے زیادہ بے حجابی ہوگی مگر اس بے حجابی کے بعد بھی رداء کبریا کا حجاب باقی رہے گا جیسا حدیث میں مصرح ہے البتہ وہ رویت سے مانع نہ ہوگا گو ادراک کنہ(۲) سے مانع ہو۔ بہرحال اس جملہ میں رسول اللہ ﷺ کو ارتفاع حجاب کی بشارت دی گئی ہے کہ رویت بواسطہ خلق کا زمانہ ختم ہوا۔ اب ہم کو بلاواسطہ دیکھو، سب حجابات رفع کردیئے گئے۔ صرف ایک حجاب ناسوتی باقی رہ گیا ہے۔ وہ تو ایک تجلی سے مرتفع ہوجائے گا جیسے ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ غالباً بوعلی قلندر ہیں۔

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تانہ بینم روح تو روح رمیدن ندہم(۳)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تجلی روح رمیدن میں دخیل ہے۔

آغاز اجتہاد

حدیث میں آیا ہے کہ آپ اخیر عمر میں ان کلمات کی بہت کثرت فرماتے تھے۔ سبحانك اللهم اغفرلی (۴) اور یہ بھی آیا ہے بتاویل القرآن یعنی فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (۵) میں جو امر ہے اس کی تعمیل میں یہ الفاظ بکثرت پڑھا کرتے تھے۔ یہاں ایک لطیفہ ہے یحییٰ علیہ السلام کے قرب ولادت کی علامت تسبیح زکریا علیہ السلام کی۔ یہاں حضور ﷺ کو تسبیح کی تعلیم فرمائی گئی۔ جس سے اشارہ ہے کہ آپ کی ولادت (یعنی ملکوتیہ) قریب ہے۔

کفارہ مجلس

پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کلمات کو کفارۃ المجلس

(۱) ''اب وہ وقت آگیا کہ میں عُریاں ہوجاؤں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بن جاؤں'' (۲) حقیقت کے جاننے سے رکاوٹ کا باعث ہوگا (۳) ''اگر میری جان نکالنے کے لیے ملک الموت آجائے تو جب تک تیرا پرتو نہ دیکھ لوں جان نہ نکالنے دوں'' (۴) ''اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے اے اللہ مجھے بخش دے'' (۵) '' پس آپ اپنے رب کی تسبیح وتمہید کیجئے اور اس سے استغفار کیجئے''۔

بھی فرمایا ہے کہ مجلس سے اٹھنے کے وقت ان کو کہہ لیا کرے تو اس مجلس میں جو لغویات اور فضولیات اور غفلت ہوگئی تھی اس کا کفارہ ہوجاتا ہے۔ یعنی ان کلمات میں یہ خاصیت ہے کہ ان سے حجاب مرتفع ہوجاتے ہیں۔ پس حق تعالیٰ نے تو یہ کلمات حضور کے لیے تجویز فرمائے اور حضور نے اپنے فیض میں امت کو بھی شریک فرمالیا اور ان کے لیے بھی یہ فیض چھوڑ دیا کہ اس کو کفارہ مجلس بنادیا۔ تو دوسری یہ برکت ہے حضور کے اس سفر آخرت کی۔ جو اس سورت میں مذکور ہے۔ یعنی مشاہدہ بلا حجاب اور آپ کے لیے تو اس کا موجب برکت ہونا ظاہر ہے لیکن بواسطہ اس میں امت کے لیے بھی برکت تھی۔ وہ واسطہ یہ کہ آپ کو اس تیاری کا حکم بسبب آپ کے بلانے کے ہے اور آپ کا بلانا سبب ہے تکمیل اسلام کا۔ جیسا اوپر مذکور ہوا اور تکمیل اسلام کا امت کے لیے موجب برکات ہونا ظاہر ہے۔(۱)

اور ایک نعمت اس واقعہ میں آپ کی امت کے لیے اور ہے جو متفرع ہے نعمت تکمیل دین پر۔ چونکہ ملزوم کا ذکر لازم کا ذکر ہے اس اعتبار سے گویا وہ بھی اس سورت میں مذکور ہے اور اسی طرح آیت اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ (۲) الخ۔ میں بھی اس نعمت کو مذکور قرار دیا جائے گا اور وہ نعمت یہ ہے کہ اس میں امت کو اجتہاد کی اجازت ہوگئی۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ تکمیل دین (جو کہ مدلول ہے سورہ نصر اور آیت اکملت کا) بایں معنی تو ہے نہیں کہ تمام جزئیات صریحاً مذکور ہیں بلکہ کچھ فروع ہیں اور کچھ اصول ہیں جن سے فروع حادثہ کا حکم مستنبط ہوسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ آپ کے سامنے اجتہاد کون کرتا اور ضرورت ہی کیا ہوتی۔ پھر اجتہاد کے ذریعہ سے ائمہ مجتہدین کے جو کہ حضور کے خلفاء اور وارثان رسول ہیں جو درجات بلند ہوئے وہ کہاں ہوتے اور عام امت کو اختلافات مجتہد ہی سبب توسع ہوا ہے وہ کہاں ہوتا۔ یہ سب برکات آپ کے سفر آخرت سے مسبب ہیں۔

برکات سفر آخرت

یہ تو وہ ہیں جو سورت کے مدلول ہیں صراحتاً اشارتاً۔ اب اس کے بعد حسب

(۱) المستدرک للحاکم: ۱/ ۵۰۲ (۲) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کردیا'' سورۃ المائدہ: ۳۔

وعدہ بقیہ برکات کا بلا کسی ترتیب کے احادیث سے بیان کرتا ہوں جو حضور کے سفر آخرت کے متعلق ہیں۔ آپ کے لیے بھی اور امت کے لیے بھی اول مختصراً حدیث لاتا ہوں پھر اس کے ذیل میں وہ برکات وفضائل جو اس حدیث کا مدلول ہیں۔

پہلی حدیث: ارشاد نبوی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امت پر رحمت فرمانا چاہتے ہیں تو اس امت کے پیغمبر کو امت سے پہلے وفات دے دیتے ہیں اور اس پیغمبر کو اس امت کے لیے بطور میر سامان اور سلف کے آگے بھیج دیتے ہیں اور جب کسی امت کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو پیغمبر کے زندہ رہتے ہوئے اس کو سزا دیتے ہیں اور ہلاک کر دیتے ہیں اور وہ پیغمبر دیکھتا ہوتا ہے (رواہ مسلم) اس سے آپ کے سفر آخرت کا امت کے حق میں علامت رحمت ہونا معلوم ہوا۔

دوسری حدیث: آپ ان لوگوں کا ثواب بیان فرمارہے ہیں جن کی اولاد بچپن میں مرجاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ جس کا کوئی بچہ آگے نہ گیا ہو۔ آپ نے فرمایا، اپنی امت کے لیے میں آگے جاتا ہوں کیونکہ میری وفات کے برابر ان پر کوئی مصیبت نہ ہوئی ہوگی۔ (رواہ الترمذی) امت کے لیے آپ کی وفات کی ایک حکمت معلوم ہوئی کہ اس پر صبر کرنے سے ثواب عظیم کے مستحق ہوئے۔

تیسری حدیث: حضور نے فرمایا کہ جس پر کوئی مصیبت پڑے وہ میرے وفات کے واقعہ مصیبت کو یاد کر کے تسلی حاصل کرے (رواہ ابن ماجہ) اس میں ثواب کے علاوہ اور حکمت تسلی کی معلوم ہوئی (۱)۔

چوتھی حدیث: قیس بن سعد نے آپ کے سامنے سجدہ کرنے کی آپ سے اجازت چاہی آپ نے فرمایا اچھا اگر تم میری قبر پر گزرو تو کیا اس کو بھی سجدہ کروگے۔ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا تو بس ایسا مت کرو (رواہ ابوداؤد) اس سے بھی ایک حکمت وفات کی مستنبط ہوئی کہ آپ ہمیشہ ظاہر میں زندہ رہتے تو عجب نہیں ہزاروں نادانوں کو آپ پر شبہ الوہیت کا ہوجاتا اور حفاظت ایمان امت کے لیے یہ بڑی رحمت ہے۔

پانچویں حدیث: چھٹی، ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں حدیثیں (یہاں سے پچیسویں

(۱) الکامل فی الضعفاء لابن عدی: ۲/ ۴۹۶۔

حدیث تک سب روایات نشر الطیب سے لی ہیں) جن سے برزخ میں آپ کے یہ فضائل ثابت ہوتے ہیں۔

(۵) اعمال امت کا ملاحظہ فرمانا یہ حیات میں استیعاب کے ساتھ نہ تھا (۶) آپ کے جسد مبارک کا زمین پر حرام ہونا حیات میں اسباب طبعیہ سے تاثر ہوتا تھا (۷) قبر میں نماز پڑھنا یہ حیات میں ہر وقت نہ تھا (۸) درود پڑھنے والوں کا آپ کو درود پہنچانا یہ حیات میں غائبین کے لیے نہ تھا (۹) خاص قبر شریف کا درود خود سننا حیات میں بعض مشاغل سماع قریب سے مانع بھی ہوجاتے ہیں (۱۰) آپ کے مزار شریف پر ستر ہزار فرشتوں کا روزانہ حاضر ہونا یہ حیات میں منقول نہیں۔

گیارہویں حدیث: قیامت میں آپ کی سیادت عامہ اور شفاعت اولیاء ظاہر ہوگی۔ (رواہ مسلم)

بارھویں حدیث: آپ کی امت کی کثرت کا قیامت میں ظاہر ہونا اور سب سے اول جنت کا دروازہ کھلوانا (رواہ مسلم)

تیرھویں حدیث: قیامت میں بالتخصیص آپ کا براق پر سوار ہونا (رواہ ابن رنجویہ)

چودھویں حدیث: شفاعت کبریٰ آپ کو عطا ہونا (رواہ الشیخان)

پندرھویں حدیث: لواء الحمد کا قیامت کے روز آپ کے ہاتھ میں ہونا (رواہ الترمذی)

سولہویں حدیث: سب سے پہلے قبر شریف سے مبعوث ہونا اور اس وقت ستر ہزار فرشتوں کا آپ کے جلو میں ہونا (رواہ الترمذی والدارمی)

سترھویں حدیث: بعد انشقاق قبر کے سب سے اول آپ کو جوڑا پہنایا جانا (رواہ الترمذی)

اٹھارویں حدیث: پل صراط پر اپنی امت کو لے کر سب سے پہلے گزرنا (رواہ الشیخان)

انیسویں حدیث: سب سے زیادہ آپ کی امت کا حوض کوثر پر مجتمع ہونا (رواہ الترمذی)

بیسویں حدیث: شفاعت کے مضمون میں آپ کے ذہن میں ایسے مضامین وارد ہونا جواب تک کسی کے ذہن میں نہیں آئے۔

اکیسویں اور بائیسویں حدیث: مقام محمود اور وسیلہ آپ کو عطا ہونا

تیئیسویں حدیث: آپ کو جنت میں ایک ہزار محل ملنا۔
چوبیسویں اور پچیسویں حدیث: آپ کی امت میں سے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا بعد انبیاء کے تمام کہول (۱) اہل جنت کا سردار ہونا اور حضرت فاطمہ کا سب بیبیوں کا سردار ہونا اور حسنین کا سب جوانوں کا سردار ہونا (رواہ الترمذی) یہ بھی آپ کی فضیلت مختصر ہے کہ آپ کے آل واصحاب کی یہ فضیلت ظاہر ہوئی۔

ظاہر ہے کہ یہ سب برکات بعد وفات ہی کے ظاہر ہوئیں اس مختصر فہرست برکات سے کہ سب کا مقدمہ وفات شریف ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں آپ کی توجہ ملاء اعلیٰ کی نعمت ہونے کے وجوہ اور نیز امت کے حق میں اس کی رحمت ہونے کے وجوہ ثابت ہوتے ہیں۔

جان گدازی ودلنوازی

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ واقعہ کسی حیثیت سے بھی مصیبت نہیں۔ اول تو خود روایات بالا میں بعض حکمتیں خود مصیبت ہونے ہی پر متفرع ہیں۔ دوسرے صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو بعد انبیاء علیہم السلام کے اکمل البشر ہیں۔ علماً بھی عملاً بھی حالاً بھی ان سے اضطراب کے اقوال وافعال صادر نہ ہوتے اور وہ تو بشر تھے ملائکہ تک سے تاسف اور بکاء ثابت ہے۔ چنانچہ بیہقی کی روایت میں ہے کہ آپ کے اخیر وقت میں جبرئیل علیہ السلام نے کہا۔ ھذا اخر موطئی فی الارض۔ یعنی یہ میرا آخری آنا ہے زمین پر یعنی وحی لے کر۔ اس کے سیاق سے تاسف ظاہر ہے اور ابونعیم نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ جب آپ کی روح قبض ہوئی تو ملک الموت روتے ہوئے آسمان کو چڑھے اور میں نے آسمان سے آواز سنی۔ واہ محمداہ۔ اس سے بکاء عزرائیل علیہ السلام کا ثابت ہے اور ابن ابی الدنیا نے حضرت انس سے آپ کی وفات کے بعد حضرت خضر علیہ السلام کا تعزیت کے لیے اصحاب کے پاس آنا اور ان کا رونا روایت کیا ہے۔ اگر خضر علیہ السلام پیغمبر ہوں اور اہل حق کے نزدیک پیغمبر ملائکہ سے افضل ہوتے ہیں تو ان کا رونا ملائکہ کے رونے سے بھی زیادہ عجیب ہے اور دلیل ہے اس کے مصیبت ہونے کی۔

تیسرے روایات میں مصیبت ہونے کی وجوہ کی تصریح بھی ہے۔ چنانچہ مرفوع

(۱) ادھیڑ عمر۔

حدیث میں مسلم نے ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے اصحاب کے لیے سبب امن ہوں۔ جب میں چلا جاؤں گا تو موعودہ بلائیں (حروب فتن) ان پر آویں گی اور میرے اصحاب میری امت کے لیے امن ہیں جب میرے اصحاب چلے جائیں گے تو موعودہ بلائیں (بدعات وشرور) امت پر آویں گی۔ اور اوپر کی ایک روایت میں ام ایمن کا قول کہ آسمان سے وحی منقطع ہوگئی۔ جس نے حضرت ابوبکر وعمر کو بھی رلایا۔ آچکا ہے۔ یہ تینوں امر اس کے مصیبت ہونے پر صریح دلیل ہیں۔ اور ایک واقعہ کا مختلف حیثیتوں سے مختلف اوصاف سے موصوف ہونا کوئی امر غریب نہیں۔ پس مصیبت ہونے کی حیثیت سے دل گداز ہے اور رحمت ہونے کی حیثیت سے جاں نواز ہے۔ اس کی مثال حسیات میں عروس (۱) کا رخصت کرنا ہے کہ متعلقین کے قلب میں دو حیثیتوں سے سرور اور قلق کس طرح جمع ہوتا ہے۔ عشاق غیر محققین نے وصف اول (یعنی دلگدازی) پر نظر کر کے مولد میں اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس وصف کو مانع قرار دیا اور محققین وصف ثانی (یعنی جاں نوازی) پر نظر کر کے مولد میں بھی یا بجائے مولد کے اس کو بیان کرنے کے لیے اس وصف کو مقتضی قرار دیا۔ چنانچہ میں نے اس وقت محققین ہی کی تقلید کی ہے۔

فکر وفات

اب اس میں دو مرتبے اور رہ گئے۔ تتمیماً للفائدہ (۲) ان کا حکم بھی معلوم کرنا چاہئے۔ ایک مرتبہ یہ کہ بیان تو کیا جاوے وصف اول کی حیثیت سے مگر مقصود صرف آپ کی یاد ہو۔ یہاں نہ وصف اول مانع ہے نہ وصف ثانی مقتضی کیونکہ وصف ثانی پر نظر ہی نہیں۔ دوسرا مرتبہ یہ کہ بیان بھی کیا جاوے وصف اول کی حیثیت سے اور مقصود بھی جلب غم ہو۔ یہاں وصف اول بانضمام اس قصد کے مطلقاً مانع ہوجاوے گا۔ خواہ ذکر مولد کے ساتھ ہو خواہ مستقلاً۔ کیونکہ قصداً کسی واقعہ کو یاد کر کے جلب غم کرنا شریعت میں ماتم ہے جو منہی عنہ ہے جیسا ایام محرم میں یا دوسرے زمانہ میں شہادت حضرات حسنین کا اس قصد سے تذکرہ کرنا بتصریح فقہاء بدعت وناجائز ہے۔ جیسا عوام میں وفات نامہ کے نام سے رسالے مروج ہیں اور اس میں قصداً اس واقعہ پر حزن وبکاء (۳) کے فضائل مذکور

(۱) دلہن (۲) فائدے کی تکمیل کے طور پر (۳) رونا اور غم کرنا۔

ہیں اور عوام اس کے معتقد اور عامل ہیں مجھ کو ایک وفات نامہ کا ایک شعر یاد آیا۔

محمد کے غم میں جو آنسو چلیں وہ آنکھیں نہ دوزخ میں ہرگز جلیں

سو یہ محض غلط ہے اور قصداً غم کے لیے رونا تو کیا ثواب ہوتا بلا قصد غم میں رونا بھی محض مباح ہی ہے، فضیلت اس کی بھی نہیں البتہ حق تعالیٰ کی محبت یا خشیت سے رونا خواہ قصداً جوتبا کی (۱) کہلاتا ہے خواہ بلا قصد جو بکاء کہلاتا ہے۔ اس کی فضیلت البتہ وارد ہے۔ بہرحال اس وقت وصف ثانی پر نظر کر کے اس ذکر شریف کو اختیار کیا گیا ہے اور الحمد للہ بوجہ احسن بتقریر ابین (۲) بیان ہوگیا۔ اس لیے اب اس کو ختم کرتا ہوں مگر اس وقت اثنائے وعظ کے دو مضمون کے متعلق ایک تتمہ یاد آیا جو موقعہ پر ذہن سے نکل گیا تھا ختم سے پہلے ان کو بیان کرتا ہوں۔

رفع اشکالات

ایک مضمون تو یہ ہے کہ میں نے یہاں کی موت کو ولادت ثابت کیا تھا۔ دوسرا مضمون یہ ہے کہ یہاں کی ولادت کو موت ثابت کیا تھا اور یہی دو مضمون گویا روح ہیں تمام بیان کی۔ مضمون اول کا تتمہ یہ ہے کہ اس کی مزید تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو حکیم ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ دنیا سے آدمی کے انتقال کرنے کو بس اس مثال کے مشابہ پاتا ہوں جیسے بچہ ماں کے پیٹ سے یعنی اس تنگی و تاریکی سے دنیا کی کشادگی میں آتا ہے آہ یعنی آنے کے قبل اس کو بڑی راحت کی جگہ سمجھتا تھا مگر دنیا کی راحت و لذت دیکھ کر پھر رحم میں جانا نہیں چاہتا۔ اسی طرح دنیا میں رہ کر آخرت سے گھبراتا ہے مگر وہاں جا کر پھر یہاں آنا پسند نہیں کرے گا۔ یہ تفسیر خود ایک حدیث میں آئی ہے۔ اخرجہ ابن ابی الدنیا مرفوعاً۔ اس سے تائید اس عویٰ کی ظاہر ہے کہ سفر آخرت بھی ولادت ہے اور واقعی اگر زندگی فطرت یعنی شرع کے موافق ہو کہ دین تو فطری ہے پھر تو مرنا ویسی ہی حیات ہے جیسا ولادت کہ وہ بھی فطرت پر ہوتی ہے ورنہ پھر وہ زندگی حیات کہنے کے قابل نہیں وہ تو موت سے بدتر

(۱) بتکلف رونا (۲) بہت عمدہ انداز میں بیان ہوگیا۔

ہے کسی بزرگ کا اس کے متعلق خوب لطیفہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

یاد داری کہ وقت زادن تو ہمہ خنداں بدند تو گریاں(۱)

پیدائش کے وقت سب تو ہنس رہے تھے اور تم رو رہے تھے۔ تو یہ لوگ بڑے بے درد تھے جو تمہارے رونے کے وقت ہنس رہے تھے۔ اب تم ان سے اس کا اس طرح بدلہ لو کہ۔

آنچناں دی کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں ودند تو خنداں(۲)

تم اس طرح جیو کہ مرتے ہوئے اور تو روئیں اور تم ہنسو کہ باولے کیوں رو رہے ہیں میں تو اب پہلے سے زیادہ راحت میں جا رہا ہوں۔ یہ تو تتمہ تھا مضمون اول کا۔

اشکال دوم کا رفع

دوسرے مضمون کا تتمہ یہ ہے کہ میں نے اس میں یہ کہا تھا کہ یہاں کی ولادت اس عالم سے انتقال ہے تو اس اعتبار سے وہاں کی موت ہوئی۔ پھر اس پر سوال کیا تھا کہ پھر چاہئے کہ اس وقت عالم ارواح میں شور وشیون ہو جائے۔ اس کا ایک جواب یہ دیا تھا کہ وہاں کے ادراکات اور ہیں یہاں کے اور۔ وہ ارواح جانتے ہیں اور ان کو مشاہدہ بھی ہوا ہے کہ دنیا میں جا کر پھر عود کر آوے گا۔ اس لیے ان کو غم نہیں ہوتا بخلاف دنیا والوں کے کہ ان کا یہ ادراک ہے کہ یہ شخص پھر عود نہ کرے گا اس لیے رنج ہوتا ہے اور یہ بھی بتلایا گیا تھا کہ اگر ارواح کو کسی روح کا عدم موقتا یا موبدا معلوم ہو جاتا ہے یعنی جہنم میں کسی مردہ کا چلا جانا تو وہ اس وقت غم کرتی ہیں کیونکہ اب ان کا ادراک خاص اعتبار سے اہل دنیا کے ادراک کے مثل ہوگا اور اگر ان کے ادراک کے موافق وقوع ہو گیا یعنی روح ان کے پاس آ گئی تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ اس کا تتمہ یہ ہے کہ یہاں شبہ ہوتا ہے کہ ظاہر ہے ارواح تو امور طبعیہ سے ساذج ہوں گی کیا ان میں بھی یہ مادہ فرح وغم کا جو کہ امور طبعیہ ہیں موجود ہے؟ جواب یہ ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہے تو ارواح اس کی روح کا استقبال کرتی ہیں اور ایسی خوش ہوتی ہیں جیسے تم اپنے عزیز کے سفر سے واپسی پر خوش

(۱) ''تجھے اپنی پیدائش کا منظر معلوم ہے تیرے رشتہ دار ہنس رہے تھے اور تو روتا تھا'' (۲) ''دنیا میں تو اس طرح رہ کر تیری موت پر سب روئیں اور تو ہنستا ہوا جائے''۔

ہوا کرتے ہو۔ اور پھر یہ بھی ابن ابی الدنیا اور طبرانی نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ زندوں کے اعمال مردوں پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر اچھی بات معلوم ہوتی ہے تو خوش ہوتے ہیں اور اس کے لیے تکمیل عمل کی دعا کرتے ہیں اور بری بات معلوم ہوتی ہے تو (رنجیدہ ہوکر) توفیق عمل کی دعا کرتے ہیں۔ نیز حدیث میں ان کا فرح اور ان کا اناللہ وانا الیہ راجعون کہنا جو کہ دلیل حزن ہے وارد ہے تو پھر اس میں کیا شبہ رہا کہ ان میں بھی مادہ فرح وغم کا ہے تو ان میں طبیعت کا اثر تو ہے مگر درجہ حکومت وغلبہ تک نہیں۔

جواب ثانی میں اس کی طرف اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے البتہ ذوقا معلوم ہوتا ہے کہ جو ارواح ابھی دنیا میں نہیں آئیں ان میں ان امور سے محض سزا جت ہے اور راز اس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور طبعیہ موقوف ہیں۔ تلبس طبیعت پر اور وہ موقوف ہے تلبس جسد پر کیونکہ جسد ارواح کو اعمال کے لیے(۱) عطا ہوا ہے اور اعمال سے ابتلا مقصود ہے اور ابتلا بدوں جذبات طبعیہ کے ہوتا نہیں اور ان اعمال کا اثر بعد موت بھی رہتا ہے اسی پر جزاوسزا ہے۔ پس بعد مفارقت اجساد بھی فرح وحزن(۲) اپنے اعمال پر رہنا ضروری ہے اور جب یہ مادہ اُن میں موجود ہے تو دوسروں کے احوال واعمال سے بھی کبھی متعلق ہوجاتا ہے اور یہ امر ارواح منزہہ عن الجسد میں متحقق نہیں۔ لہٰذا وہ فرح وحزن سے بھی مبرا ہیں۔ واللہ اعلم۔

نیز قرآن مجید میں شہداء کی نسبت احیاء منتظرین کے متعلق یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ (وہ خوش ہوتے ہیں) وارد ہے۔ نیز مومن کی شان میں لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (۳) اور خوف وحزن کا عدم منجملہ اعدام ملکات ہے۔ نیز کفار کا خوف وحزن مصرح ہے اور یہ سب ارواح ہی کے لیے ثابت ہیں۔ ثابت ہوگیا کہ ارواح میں یہ مواد موجود ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے میں حکمت

اور یہاں سے ایک لطیفہ کی تائید ہوگئی جو استاد علیہ الرحمۃ نے آدم علیہ السلام کے

(۱) روح کو جسم عمل کرنے کے لیے دیا گیا (۲) جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی اپنے اعمال پر خوشی وغم ہونا ضروری ہے (۳) ''نہ انہیں خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے'' سورۂ یونس: ۶۲۔

اکل شجرہ ونزول من الجنہ (۱) کے متعلق بیان فرمایا تھا اور اس سے معلوم ہوگا کہ مولانا کے علوم کیسے لطیف تھے۔ فرمایا کہ یہ بھی حق تعالیٰ کی بڑی حکمت ہوئی کہ انہوں نے اس درخت منہی عنہا کو کھالیا اور جنت سے زمین پر آ گئے۔ اگر آدم علیہ السلام ضبط کر لیتے اور نہ کھاتے تو ساری اولاد پر مصیبت ہوتی کیونکہ مثل آدم علیہ السلام کے ظاہراً مجسد ومکلّف امر ونہی کے وہ بھی ہوتے اور جذبہ طبعیہ کے غلبہ سے ضبط نہ ہوسکتا اس لیے یہ لوگ ضرور کھاتے پھر جنت سے نکالے جاتے کیونکہ اس درخت کی یہ خاصیت ہے کہ اس کے کھانے والا جنت میں نہیں رہ سکتا یا تو اس لیے کہ اسے کھا کر قضاءحاجت کی ضرورت ہوتی ہے اور جنت میں بم پلس (۲) نہیں ہے جیسا کہ بعض عارفین نے یہی وجہ بیان کی ہے یا کوئی اور وجہ ہو۔ بہرحال جو اسے کھاتا وہ جنت سے نکالا جاتا اور اس وقت اس حال میں نکلتے کہ جنت میں کسی کی ماں ہے کسی کا باپ ہے کسی کی بہن ہے کسی کی اولاد ہے، تو ایک کے نکلنے سے جنت میں کہرام مچ جاتا تو وہ دوزخ بن جاتی کیونکہ ارواح میں تلبس الاجساد کے اثر سے مادہ حزن وغم کا موجود (۳) ہی تھا۔ پھر ایک کے نکلنے کے بعد ہر دم ہر شخص پر بھی احتمال رہتا تو عیش منغص ہوجاتا۔ اور اب آدم علیہ السلام کے اترنے میں ہمارا تو یہ فائدہ ہوگیا کہ اس مفارقت اہل واولاد کے غم سے بچے رہے (اور گو دنیا میں اس مفارقت کا صدمہ پہنچتا ہے مگر یہ اس صدمہ سے کم ہے یہاں محض طبعی رنج ہوتا ہے حزن عقلی نہیں ہوتا کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ مرنے والا دارالحزن سے دارالنعیم میں جارہا ہے اور وہاں مفارقت سے حزن طبعی بھی ہوتا عقلی بھی کیونکہ جنت سے دنیا میں آنا راحت سے تکلیف میں آنا ہوتا پھر بھی خطرہ لگا رہتا کہ دیکھئے یہ شخص جا کر جنت میں واپس آتا ہے یا جہنم میں جاتا ہے۔ اس سے حزن عقلی کو اور ترقی ہوتی اور دنیا سے جب کوئی جاتا ہے تو چونکہ آخرت کا حال ہم کو معلوم نہیں اس لیے ہر شخص اپنی میت کے ساتھ اچھا ہی گمان رکھتا ہے اس لیے یہاں حزن عقلی نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت کوئی بدحالی قطعی نہیں اس لیے عود الی الجنہ کا احتمال غالب رہتا ہے اور جنت سے نکلنا قطعی بدحالی تھی اسی کا اثر

(۱) جنت میں ممنوع درخت کا استعمال پھر جنت سے نکلنا (۲) ہگنے کی جگہ نہیں (۳) جسم کے ساتھ تلبس ہونے کی وجہ سے غم وحزن ہونا۔

غالب رہتا اور عود الی الجنہ کا احتمال مغلوب ۱۲) اور آدم علیہ السلام کا کچھ نقصان نہیں ہوا کیونکہ وہ تو مرتے ہی راحت میں پہنچ گئے ہیں اور جنت برزخیہ میں تو فی الحال ہی داخل ہو گئے اور ایک دن جنت معہودہ میں بھی پہنچ ہی جائیں گے ان کی تو بچھڑی ہوئی جنت جلد ہی مل جائے گی اور اس چند روز یعنی مدت بقاء فی الدنیا میں مفارقت جنت سے گو ان کو طبعاً رنج ہوا مگر عقلا رنج نہیں ہوا کیونکہ ان کو بوجہ عطا نبوت وقبول توبہ اس مفارقت کا عارضی ہونا متیقن تھا۔ دوسرے دنیا میں آنا ان کے لیے موجب ترقی باطنی ہوا جیسا ابھی مذکور ہوتا ہے تو ان کے نزدیک یہ ایسا تھا جیسا کہ آپ اپنی اولاد کو کبھی لندن یا جامعہ ازہر بھیج دیتے ہیں۔ کیوں؟ ترقی درجات کے لیے تو کیا اس مفارقت سے عقلی غم ہوتا ہے۔

آدمؑ کا دنیا میں نزول باعث ترقی تھا

باقی یہ کہ یہ نزول ترقی کیسے تھا اس کو حضرت حاجی صاحب نے اس طرح تحقیق فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی معرفت جنت میں بھی حاصل تو تھی مگر ایسی کامل نہ تھی جیسی دنیا میں آ کر کامل ہو گئی کیونکہ پہلے تو وہ حق تعالیٰ کی صفات منعم معطی محسن وامثالھا کو تو عین الیقین سے جانتے تھے کیونکہ ان صفات کے آثار ان پر وارد تھے۔ مگر صفات غفور وتواب ومنتقم کو صرف علم الیقین کے درجے میں جانے ہوئے تھے عین الیقین کے درجہ میں ان کا پورا انکشاف نہ ہوا تھا اکل شجرہ وخروج عن الجنہ سے ان صفات کا کامل مشاہدہ ہو گیا۔ کما قیل۔

گناہ من ارنا مدے در شمار ترا نام کے بودے آمرزگار(۱)

یعنی کے ظہور او بودے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ جنت سے آدم علیہ السلام ہی کا اترنا اس لیے اچھا ہوا کہ ان کا کچھ نقصان نہیں ہوا اور ہمارا فائدہ ہو گیا۔ یہاں بحمد اللہ دونوں تتمے بھی ختم ہوئے جس سے مضمون مقصود ختم ہوا۔

نعمت موت

اب اس مضمون پر ایک تفریع اور باقی ہے کہ اس میں اقتداء ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۱) ''اگر میرے گناہ گنتی میں نہ آتے تو آپ کا نام غفور کیسے ہوتا''

کا آپ کے اس واقعہ ولادت ملکوتیہ میں بس پھر بالکل ختم۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں ارشاد ہے۔ لَقَدْ كَانَ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۲) اور یہاں کوئی قید ہے نہیں تو یہ اپنے اطلاق سے اس پر دال ہے کہ حضور کی ہر حالت قابل اقتداء ہے اور ایک حالت آپ کی یہ بھی ہے جس کا اس وقت مفصل بیان ہوا یعنی سفر آخرت کا آپ کے لیے نعمت ورحمت ہونا۔ تو اس میں بھی ہم کو اقتداء کرنا چاہئے اور وہ اقتداء یہ ہے کہ ہم اپنی حالت ایسی درست کریں کہ موت ہمارے لیے بھی نعمت ورحمت ہوجاوے اور اس لیے وہ ہم کو حیات سے زیادہ مرغوب ومحبوب وموجب راحت ولذت ہوجائے اور اس کی کراہت ووحشت عقلیہ باقی نہ رہے اور اس کا طریق مرکب ہے دو جزو سے۔ ایک جزو اعمال وعقائد کا درست کرنا ہے دوسرا جزو اس بیان کئے ہوئے مضمون کا بار بار مستحضر کرنا اور اس کا مراقبہ کرنا ہے تاکہ دنیا میں جو ہمارا دل لگا ہوا ہے اس میں کچھ کمی ہو اور موت سے وحشت کم ہو۔ کیونکہ میں نے بتلادیا کہ مسلمان کو موت کے بعد جو حیات حاصل ہوتی ہے وہ اس حیات سے بدرجہا افضل واکمل واقوی وادوم ہے اور جس کو تم موت کہتے ہو حقیقت میں وہ بھی ایک قسم کی ولادت ہے جو اس ولادت ناسوتیہ سے بہتر ہے۔

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی جب مرجاتا ہے تو بس ایک گڑھے میں اس کو دفن کردیتے ہیں اور وہ وہیں پڑا رہتا ہے اور چند روز میں گل سڑ کر خاک ہوجاتا ہے اسی خیال نے لوگوں کو موت سے متوحش کررکھا ہے۔ صاحبو! انسان جسم کا نام نہیں ہے۔ یہ حال جو تم بیان کرتے ہو جسم کا ہوتا ہے روح کا یہ حال نہیں ہوتا۔ وہ تو عالم ارواح میں اور دارالنعیم میں پہنچتی ہے اور انسان اسی روح سے انسان ہے وہی اصل چیز ہے اسی سے انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس جسد کا جو احترام کیا جاتا ہے حیات میں بھی اور بعد موت کے تحسین کفن وتوسیع قبر واستعمال حنوط وحمل علی الاعناق (۱) وصلوٰۃ جنازہ سے بھی یہ سب بھی روح ہی کی وجہ سے ہے۔ اگر روح قابل احترام ہے تو جسد بھی قابل احترام ہے

(۲) ''تمہارے لیے رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ بہترین نمونہ ہے'' سورۃ الاحزاب: ۲۱ (۱) اچھا کفن کشادہ قبر خوشبو کا استعمال اور گردنوں پر اٹھا کر قبرستان لیجانا۔

ورنہ بے شمشیر (۲) کا نیام ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

گشتن ومردن کہ بر نقش تن ست چوں انار وسیب را بشکستن ست (۱)

کچھ اور اشعار بھی ہیں جو وقت تبییض کے لکھوادوں گا۔ چنانچہ اب لکھے جاتے ہیں۔

آنچہ شیریں ست آن شد یار دانگ وانچہ پوشیدہ ست نبود غیر بانگ

آنچہ پرمغزست چوں مشک ست پاک وانچہ پوشید ست نبود غیر خاک

آنچہ با معنی ست خوش پیدا شود آنچہ بے معنی ست خود رسوا سود

جان بمعنی درین تن بے خلاف ہست ہمچون تیغ چو بین در غلاف

تا غلاف اندر بود باقیمت است چوں بروں شد سوختن را آلت است (۲)

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو عام لوگوں میں مشہور ہے کہ قبر کے تختے اونچے رکھے جائیں کہ آدمی قبر میں بیٹھے تو تختے سر کو نہ لگیں تاکہ بیٹھنے میں میت کو تنگی نہ ہو۔ یہ بے اصل بات ہے کیونکہ مردہ کا جلوس وقعود جو احادیث میں وارد ہے وہ اور قسم کا ہے۔ یعنی برزخی ہے اس کے لیے یہ تختے مانع نہیں ہوسکتے بلکہ یہ توسیع وغیرہ جیسا کہ بیان کیا گیا اکرام ہے جسد مسلم کا اس کی روح کے سبب سے۔ پس اصل چیز انسان میں یہی روح ہے سو ہم کو اس کی درستی کی کوشش کرنا چاہئے۔ جس کا طریقہ اوپر بتلاچکا ہوں یعنی اعمال صالحہ وعقائد صحیحہ واستحضار منافع موت اگر یہ درستی ہم نے کرلی تو یہ موت ہمارے لیے حیات طیبہ کا مقدمہ ہے اور اگر یہ درستی نہ کی تو پھر یہاں کی حیات بھی ہمارے لیے موت ہے کیونکہ موت حقیقیہ کا مقدمہ ہے اسی لیے حدیث میں غافل عن الذکر کو میت سے تشبیہ دی ہے۔ ونعم ما قیل۔

---

(۲) بغیر تلوار کی نیام (۱) ''قتل کرنا اور مرنا جو نقش جسم پر طاری ہوتا ہے انار وسیب کو توڑنے کی طرح ہے'' (۲) ''جو میٹھا ہے وہ قیمت کے لائق ہے اور جس کا حال معلوم نہیں وہ آواز کی ہے جو پرمغز ہے وہ مشک کی طرح پاک ہے اور جو پوشیدہ ہے وہ خاک جیسا ہے۔ جو بامعنی ہے وہ اچھا معلوم ہوگا اور جو بے معنی ہے وہ خود رسوا ہوگا اس جسم میں بے معنی جان بے اختلاف ایسی ہے جیسے لکڑی کی تلوار غلاف میں جب تک غلاف میں ہے باقیمت ہے اور باہر آتے ہی جلانے کے قابل ہے۔

ليس من مات فاستراح بميت انما الميت ميت الاحياء(۱)

یہ تھی وہ تفریع جو اس وعظ کے مضمون پر مقصود تھی ۔ اب میں بالکل ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام المورد الفرسخی فی المولد البرزخی رکھتا ہوں۔ اصل میں میں نے اس کا نام المولد البرزخی رکھنا چاہا تھا کیونکہ اس میں حضور ﷺ کی ولادت برزخیہ کا ذکر ہوا ہے۔ پھر جی چاہا کہ اس کا کوئی قافیہ بھی مل جائے تو مولد کا قافیہ تو مورد ملا جو ملا علی قاری کے مولد کے نام سے اخذ کیا۔ انہوں نے اپنے مولد کا نام المورد الروی فی المولد النبوی رکھا ہے۔ اس سے میں نے مورد و مولد اول کے دو لفظ اخذ کر لیے۔ پھر مضمون کے اعتبار سے مولد کے ساتھ برزخی لگایا تو یہ فکر ہوئی کہ مورد کے ساتھ برزخی کے وزن پر کوئی لفظ بڑھایا جاوے اس کے لیے مجھے قاموس دیکھنا پڑی کیونکہ برزخی کا کوئی قافیہ ذہن میں نہ تھا۔ قاموس میں لفظ فرسخ کے حاصل معنی وسیع لکھے ہیں اور یہ بیان بھی خلاف امید وسیع ہو گیا دوسرے جس عالم کی ولادت کا اس میں بیان کیا ہے یعنی برزخ وہ بھی وسیع ہے۔ اس لیے اس کا نام المورد الفرسخی فی المولد البرزخی مناسب معلوم ہوا(۱)

اب دعا کیجئے حضور کے واسطے تو دعا کرنا خلاف ادب ہے مگر نہیں درود شریف پڑھنا مشروع ہے اور وہ بھی دعا ہے۔ حضور کی شان کے مناسب دعا یہی ہے کہ آپ پر درود وسلام بھیجا جائے تو آپ کے لیے تو اس طرح دعا کیجئے اور اپنے لیے اس طرح دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ یہ برکات ہم کو عطاء فرمائیں جو حضور کے سفر آخرت میں امت کے واسطے رکھی ہوئی ہیں اور اس واقعہ خاصہ میں ہم کو آپ کی اقتداء کی جس کی میں نے ابھی تقریر کی ہے توفیق بخشے اور قبر میں اور قیامت میں ہم کو حضور اقدس رسول اللہ ﷺ کا قرب و معیت نصیب فرماوے۔ آمین (۲)

---

(۱) ''جس نے مر کر آرام پالیا وہ مردہ نہیں ہے مردہ ہے جو زندوں میں مردہ ہو'' (۱) والیاء الاولی للمبالغۃ کاحمری والثانیۃ للنسبۃ (۲) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ حیات برزخی کے بارے میں بہترین وعظ ہے۔

خلیل احمد تھانوی

۱۹۔۲۔۲۲

أخبار الجامعة

❁ مورخہ 3، 4، 5 جون 2022ء بروز جمعہ تا اتوار جامعہ ہٰذا میں تین روزہ حج تربیتی پروگرام منعقد کیا گیا۔ جس میں نائب مہتمم جناب ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی مدظلہ نے حرمین کے ماڈلز کی مدد سے تفصیلاً حج وعمرہ کے مسائل پر بیان فرمایا۔ خواتین کے لیے بھی باپردہ انتظام کیا گیا۔ تربیتی پروگرام کے اختتام پر حضرت مہتمم صاحب زید مجدہٗ نے دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے۔ بحمد اللہ تعالیٰ جامعہ کے حج تربیتی پروگرام کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے اور دور دراز علاقوں سے لوگ حج تربیتی پروگرام میں شرکت کے لیے جامعہ تشریف لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جامعہ کے اکابر کی ان مساعی کو قبول فرمائے اور جامعہ کو یوں ہی شاد وآباد رکھے۔ آمین

❁ 21 مئی 2022 کو حضرت مہتمم صاحب زید مجدہٗ نے حکومت پاکستان کے زیر انتظام قرآن بورڈ کے اجلاس میں شرکت فرمائی قرآن کریم کی بہتر اور عمدہ طباعت ونشر واشاعت کے حوالہ سے اہم تجاویز پیش فرمائیں۔

❁ 9 جون: گلگت میں وفاق المدارس کے مسؤل مولانا قاضی نثار احمد صاحب مدظلہ کی خصوصی دعوت پر گلگت کا تین روزہ دورہ فرمایا، جہاں مختلف مدارس دینیہ کے مشائخ علماء کرام سے ملاقات کے دوران دینی مدارس کے نظام ونصاب کے عصری تقاضوں اور عالمی چیلنجز پر پورا اترنے کے حوالہ سے تفصیلی راہنمائی فرمائی

❁ 10 جون: جامع مسجد گلگت میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا۔ اور بعد نماز مغرب مفتی لطف الرحمن مہتمم مدرسہ قاسم العلوم علاقہ پڑی کی دعوت پر مدرسہ کے طلباء سے خطاب فرمایا۔

❁ 11 جون: گلگت میں محفل حسن قراءۃ میں تلاوت وخصوصی بیان فرمایا اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے اعلان کے مطابق عنقریب صوبائی وقومی مسابقہ حفظ القرآن الکریم کے انعقاد کے سلسلہ میں بھی ایک اجلاس ہوا جس میں اہم ہدایات ارشاد فرمائیں اس سفر میں جامعہ ہٰذا کے فاضل مولانا قاری ہدایت اللہ گلگتی نے علاقہ میں اپنی دینی وعصری تعلیم کی خدمات پر تفصیلاً معلومات فراہم کیں۔

❁ 18 جون: پی آئی اے سوسائٹی مدرسہ بیت النور کے طلباء کے مابین مسابقہ حسن قراءۃ کی جج منٹ فرمائی اور کامیاب طلباء کو انعامات سے نوازا۔